انسپکٹر جمشید سیریز : 341
گھناؤنا کھیپ
اشتیاق احمد

محمود
فاروق
فرزانہ
اور
انسپکٹر
جمشید
سیریز ۴۳

گھناؤنا کیمپ

اشتیاق احمد

عنوانِ ناول : اشتیاق احمد
منتظمِ اعلیٰ : نقش محمد
کتابت : محمد اشفاق

بار اول : مئی ۱۹۸۱ء
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
پبلشرز : مکتبہ اشتیاق راجپوت مارکیٹ
پہلی منزل اردو بازار۔ لاہور
قیمت : ۵/۵۰ روپے

دو باتیں

گمشدہ کیمپ پڑھتے وقت اگر آپ کو دوسروں کے ساتھ ساتھ مجھ پر بھی ترس آئے تو مجھ پر تاؤ نہ کھائیے گا کہ صورت حال ہی ایسی تھی، یوں تو ترس کھانا بری بات نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ان پر ترس کھاتا ہے جو زمین پر رہتے ہوئے دوسروں پر ترس کھاتے ہیں، اس سے یہ مطلب بھی نہ نکال لیجیے گا کہ ہوائی سفر کے دوران کسی پر ترس ہی نہیں کھانا چاہیے، اور اگر ترس ہی کھانے کا شوق ہے تو مجھ پر کیوں نہ کھائیں، میرے خیال میں تو آپ کے ترس کا سب سے زیادہ حق دار میں ہوں، آپ کہیں گے آپ تو بات اس طرح لکھ گئے جیسے لکھنا چاہتے ہوں کہ آپ کے ووٹ کا سب سے زیادہ حق دار میں ہوں، معاف کیجیے، ووٹ تو مجھے آپ کا کب کا مل چکا ہے، آپ سب متفقہ طور پر مجھے ووٹ دے چکے ہیں، آپ خطوط میں اس بات کا بڑھ چڑھ کر اعلان کرتے رہتے ہیں، لہٰذا ووٹ کی بات تو جانے دیں اور ترس کی بات پر ہی گزارا کریں۔ آپ سوال کریں گے، ہم کس طرح آپ پر ترس کھا سکتے ہیں تو اس کے تو سینکڑوں طریقے ہیں، کون کون سا گنواؤں اور گنوانے بیٹھا تو یہ دو باتیں سینکڑوں باتوں پر مشتمل ہو جائیں گی۔ ناول ان کی اوٹ میں چھپ جائے گا، جبکہ نہ میں ایسا چاہتا ہوں اور نہ آپ۔ لہٰذا انہی الفاظ پر گزارا کیجیے اور دوسروں پر ترس کھاتے رہیے۔

اشتیاق احمد

ترتیب

محمود اور لڑکی

فاروق اور فرزانہ ان دنوں انفلوئنزا کا شکار تھے۔ انہیں چھینکوں پر چھینکیں آ رہی تھیں۔ ویسے بھی محمود بہت بور ہو رہا تھا۔ انفلوئنزا کے حملے کے تیسرے دن اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ جھلا کر کہنے لگا:

"بھئی! معلوم ہوتا ہے، تم دونوں کی تو انفلوئنزا سے گہری دوستی ہو گئی ہے۔ اب میں کیا کروں۔ تین دن ہو گئے ہیں گھر میں پڑے پڑے۔ بوریت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور اپنی حد تک میں بور ہو چکا ہوں، لہٰذا یا تو تم انفلوئنزا کو چھٹی دو، یا پھر میں چلا تنہا گھومنے۔"

"بھئی اس کا ایک..... آچھیں... ایک اور بھی آسان حل ہے۔" فاروق نے چھینک کر کہا۔

"جلدی بتاؤ، کیا حل ہے؟"

"یہ کہ تم بھی ہمارے ساتھ انفلوئنزا کا شکار ہو جاؤ۔"

"لعنت ہے تیرے کی، یہ تم نے حل بتایا ہے۔" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا، پھر چونک کر بولا: "ہاں ٹھیک تو کہتے ہو۔ اگر میں تمہارے آس پاس زیادہ دیر تک رہا تو میں بھی انفلوئنزا سے بچ نہیں سکوں گا۔"

لہذا میں چلا۔"

"یار بڑے بے مروت ہو، انفلوئنزا تک میں ساتھ نہیں دے سکتے۔" فاروق نے مسکرانے کی کوشش کی، لیکن حلیہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ مسکرا بھی نہ سکا۔

"بس بس! رہنے ہی دو، مسکراتے بھی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے رو رہے ہو۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"تم دونوں آپس میں خود جھگڑو، میں تو آج باہر گھومنے پھرنے ضرور جاؤں گا۔" محمود نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھائی جاؤ، لیکن اپنی خیریت کی اطلاع ضرور بھیجتے رہنا۔"

محمود نے کوئی جواب نہ دیا اور کمرے سے نکل کر صحن میں آیا۔ بیگم جمشید ایک کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھیں۔ قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے سر اوپر اٹھایا:

"کیا حال ہے اب ان دونوں کا؟"

"وہی حال ہے، میں ذرا باہر گھومنے جا رہا ہوں، پانچ بجے تک آ جاؤں گا۔"

"اچھا!" انہوں نے پرشفقت لہجے میں کہا۔

محمود گھر سے نکل کر پیدل ہی ایک سمت میں چلنے لگا۔ فاروق کے بغیر وہ اداس اداس سا تھا، ورنہ اس سے نوک جھونک میں وقت بہت اچھا گزرتا تھا۔ ایک شاپنگ سنٹر کے سامنے بہت سی کاریں کھڑی

تھیں۔ ان میں سے ایک کار کی طرف اسے دو آدمی ایک لڑکی کے ساتھ بڑھتے نظر آئے۔ لڑکی ان کے آگے آگے چل رہی تھی۔ چودہ سال کی تو ضرور رہی ہو گی۔ اس کا لباس خوش رنگ اور جسم صحت مند تھا، لیکن چمک دار آنکھوں میں خوف کروٹیں لے رہا تھا۔ محمود کے اٹھتے قدم رک گئے۔ اس نے ایک نظر غور سے لڑکی کو دیکھا، اب اسے اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ لڑکی واقعی خوف زدہ ہے۔ اب اس نے باقی دونوں کو دیکھا جو اس کے ساتھ تھے، یہ دونوں شریف صورت تھے۔ ان کے جسموں پر بہترین تراش کے قیمتی سوٹ تھے، انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ دونوں لڑکی سے صرف ایک قدم پیچھے تھے۔ محمود غیر محسوس طور پر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی وقت وہ سفید رنگ کی بڑی سی کار کے نزدیک پہنچ گئے۔ سب سے پہلے تو محمود نے کار کا نمبر ذہن نشین کر لیا، یہ ۱۳۱۲ ج ۔ ا تھا۔ اس کے بعد اس نے تیزی سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ چند قدم کے فاصلے پر اسے ایک ٹیکسی کھڑی نظر آئی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ عین اسی وقت شاپنگ سنٹر سے ایک عورت نکلی، اس نے ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تو اس کی نظر محمود پر پڑی اور وہ چونک اٹھی۔

"ٹیکسی فارغ ہے؟" محمود نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"جی نہیں! میں ایک سواری کا انتظار کر رہا ہوں، [illegible] وہ اندر

شاپنگ کے لیے گئی ہے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"اس وقت یہاں آس پاس کوئی ٹیکسی نہیں ہے، دیکھئے میرا کام نہیں چلے گا۔ معاملہ بے حد اہم ہے، لہٰذا میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے لے چلیں، آپ کی سواری کو تو کوئی رکشہ یا ٹیکسی مل ہی جائے گی۔"

"لیکن ابھی اس نے بل ادا نہیں کیا۔" ڈرائیور بولا۔

"میٹر اسی طرح چلنے دیں، سارا بل میں ادا کروں گا۔ یہ معاملہ ایک لڑکی کا ہے، میرا خیال ہے کہ دو آدمی اسے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔"

"اوہو، کہاں، کدھر؟" ٹیکسی ڈرائیور چونکا۔

"آپ اس طرف نہ دیکھیں، کہیں انہیں شک نہ ہو جائے، اس صورت میں ہم اطمینان سے تعاقب نہیں کر سکیں گے، ہمیں تو کرنا صرف یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ دیکھ آئیں گے اور بعد میں پولیس کو فون کر آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔" ڈرائیور نے بھی پرجوش لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔" محمود نے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

اسی وقت انہوں نے سفید کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ دوسرے ہی لمحے وہ کاروں کی قطار سے نکلی اور مین سڑک پر پہنچ گئی۔ انہوں نے دیکھا، ایک آدمی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا

تھا، جب کہ دوسرا لڑکی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر تھا اور اس کے ساتھ بالکل ملا بیٹھا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے مناسب فاصلے پر پہنچنے تک اپنی کار کو حرکت نہیں دی۔ آخر تعاقب شروع ہو گیا۔ سفید کار کی رفتار بہت تیز تھی۔ ڈرائیور کو بھی تیز چلنا پڑ رہا تھا۔

آگے پیچھے چلتے ہوئے دونوں کاریں شہری حدود سے باہر نکل گئیں اور جنگل شروع ہو گیا۔ یہ دیکھ کر محمود پریشان ہو گیا، اس نے کوئی چیز اپنی جیب سے نکالی اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر غیر محسوس طور پر باہر گرا دی۔ یہ عمل وہ تھوڑی دیر بعد پھر دہراتا

"ان کی منزل تو دور ہی ہوتی جا رہی ہے، فاصلہ ذرا بڑھا دیں، کیونکہ یہاں تعاقب کا علم فوراً ہو جائے گا۔" وہ بڑبڑایا۔

"بہت اچھا۔" ڈرائیور نے کہا اور رفتار کم کر لی، درمیانی فاصلہ بڑھ گیا۔

اس سنسان سڑک پر بھی دونوں کاریں تقریباً آدھ گھنٹے تک چلتی رہیں اور آخر کار ایک کچی سڑک پر مڑ گئی۔

"میرا خیال ہے، ہمیں ٹیکسی اس سڑک پر نہیں اتارنی چاہیے۔ یہاں سے میں پیدل تعاقب کروں گا، آپ ٹیکسی میں ہی ٹھہریں۔ بس میں ان کا ٹھکانہ دیکھ کر واپس آ جاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے" ڈرائیور بولا۔

محمود نیچے اتر کر کچی سڑک پر چلنے لگا، کار کافی آگے جاتی نظر آئی، سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا، کوئی پانچ منٹ تک چلتے رہنے کے بعد ایک جگہ کار کھڑی نظر آئی اور پرانی طرز کے ایک مکان کا دروازہ نظر آیا۔ اس نے سوچا، بس یہیں سے واپس چلنا چاہیے، لیکن پھر تجسس نے اسے واپس مڑنے سے روک دیا.... اس کے دل و دماغ نے کہا، کم از کم اندر ہونے والی گفتگو کا ایک آدھ جملہ تو سن لینا چاہیے، تاکہ یہ یقین ہو جائے کہ واقعی یہ اغوا کا کیس ہے، یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور دروازے سے کان لگا دیے۔

"اب تم اپنے گھر اور اپنے ماں باپ کو بھول جاؤ۔"

اندر سے آنے والی آواز نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا۔ وہ جلدی سے واپس مڑا تاکہ شہر جا کر مدد لے آئے، خدا جانے مکان میں اندر کتنے آدمی تھے، پستول وغیرہ سے لیس بھی ضرور ہوں گے جب کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا، ایسے میں اگر وہ اس مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو اندر والوں کو فوراً شک پڑ جاتا اور معاملہ بگڑ سکتا تھا، چنانچہ اس نے واپس شہر جا کر فوراً مدد لانا ہی مناسب سمجھا، لیکن جونہی وہ مڑا، ٹھٹک کر رہ گیا، اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

اس نے دیکھا، ٹیکسی ڈرائیور اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک پستول ماند پڑتی ہوئی دھوپ میں چمک رہا تھا۔

"ہمارا طریقہ یہی ہے، اپنی کار کے نزدیک ہی اپنی ٹیکسی کھڑی کر لیتے ہیں تاکہ کسی کو شک ہو جائے اور وہ تعاقب کرنا چاہے تو ہماری ہی ٹیکسی میں بیٹھ کر تعاقب کرے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم تعاقب کرنے والے سے آسانی سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں، طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ میں ٹیکسی کی لائٹوں کے ذریعے اگلی کار کو اشارہ کر دیتا ہوں، وہ کار کو انتہائی تیز دوڑا دیتے ہیں جب کہ میں ٹیکسی کی رفتار اس قدر نہیں بڑھا سکتا، فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور کسی موڑ پر کار نظروں سے بالکل غائب ہو جاتی ہے، کیونکہ ہم نے راستے بھی مقرر کر رکھے ہیں، اس طرح میں مایوسی کا اظہار کر کے تعاقب کرنے والے سے پیچھا چھڑا لیتا ہوں اور بعد میں ان سے آملتا لیکن آج چونکہ تعاقب کرنے والا ایک لڑکا تھا، اس لیے میں نے تم سے پیچھا چھڑانے کی ضرورت محسوس نہیں کی..." یہاں تک کہہ کر ٹیکسی ڈرائیور خاموش ہو گیا۔

"میں سمجھ گیا، سوال یہ ہے کہ تم لوگ چاہتے کیا ہو، بچوں کو اغوا

کر کے ان کے والدین سے رقمیں حاصل کرنے کا گروہ کا اڈہ ہے شاید تمہارا ۔

"غلط سمجھے ، اغوا کر کے رقم کا مطالبہ کرنا یہ ایک خطرناک ترین پیشہ ہے ، اس میں پکڑے جانے کے پچھتر فی صد امکانات ہیں ، کیونکہ ایک تو رقم وصول کرنے کا مرحلہ بہت ٹیڑھا ہوتا ہے ، دوسرے جب اغوا کیا جانے والا پھر واپس جاتا ہے تو وہ اغوا کرنے والوں کے حلیے اور بہت سی باتیں بتا دیتا ہیں ، جن کا سہارا لے کر سرکاری جاسوس ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس طرح اغوا کرنے والے پکڑے جاتے ہیں ، ہمارا کام ذرا مختلف ہے ، ہم جسے اغوا کر لیتے ہیں اسے پھر واپس اپنے گھر جانا نصیب نہیں ہوتا ، نہ ہم بچوں کے والدین سے لمبی چوڑی رقموں کا مطالبہ کرتے ہیں ۔"

"پھر آخر تم لوگ کرتے کیا ہو ؟" محمود نے پریشان ہو کر پوچھا ۔

"یہ ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا ..... دروازے پر دستک دو ۔"

محمود نے چند لمحوں کے لیے سوچا کہ کیا کرے ، ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور پر ٹوٹ پڑتا ، پستول اس سے چھین لیتا ، اسے جھاڑیوں میں باندھ کر منہ بند کر کے ڈال دیتا اور پھر اس کی ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر جاتا ، وہاں سے مدد لے آتا ، لیکن اس طریقے میں جان کا خطرہ زیادہ تھا ، کیونکہ ڈرائیور اس سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا اور وہ لمبی سے لمبی چھلانگ لگا کر بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا ۔ دوسرا طریقہ یہ

تھا کہ فی الحال ان کے احکامات کی تعمیل کرتا اور یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں ۔ اسے وہ لڑکی یاد آئی اور یہ خیال بھی آیا کہ نہ جانے اس جیسی کتنی لڑکیاں اور لڑکے ان لوگوں کے قبضے میں ہوں گے ، لہٰذا اندر چل کر حالات کا جائزہ لینا چاہیے ۔ اسی فیصلے پر پہنچ کر وہ مڑا اور دروازے پر دستک دے ڈالی ۔ چند لمحے تک اندر سے کوئی جواب نہ ملا اور نہ قدموں کی آہٹ سنائی دی ۔ کچھ دیر گزرنے پر چھت پر سے آواز آئی :

"ہیلو منیکا ..... یہ تم ہو ، لیکن پستول تانے کیوں کھڑے ہو ۔"

"ایک پنچھی دو کاج ۔" منیکا نے چہک کر کہا ۔

"ایک پنچھی دو کاج ..... کیا مطلب ؟" اوپر والے نے چونک کر کہا ۔

"ایک شکار ، تم پھانس کر لائے ہو ، ساتھ ہی ایک میں لے آیا ہوں ۔"

"بہت خوب مزا آ گیا ، ٹھہرو ، میں دروازہ کھولتا ہوں ۔" اس کی خوشی سے بھرپور آواز سنائی دی ۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو دروازے میں تین ہٹے کٹے آدمی دکھائی دیے ، ان میں اغوا کرنے والے نہیں تھے ، جس کا مطلب یہ تھا کہ مکان میں کئی آدمی موجود ہیں ۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں چاقو بھی تھے ۔ محمود نے محسوس کیا ، وہ جیسے زیادہ ہی گھرتا جا رہا ہے ، اندر سے مکان اور بھی پرانی طرز کا نظر آیا ۔ صحن میں سے گزر کر وہ ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے ، جہاں

وہ دونوں موجود تھے جو لڑکی کو کار میں اغوا کر لائے تھے۔ لڑکی فرش پر اکڑوں بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کے علاوہ ایک اونچی سی کرسی پر وہاں ایک موٹا تازہ آدمی بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا، پیٹ بہت آگے کو بڑھا ہوا تھا۔

"بہت خوب ٹھیکا! آج تو تم نے خوب کام دکھایا۔" موٹے نے کہا۔

"شکریہ استاد۔" ٹھیکا نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں تو ٹامی اور فارے نے بھی بہت زور دار مارا ہے، لیکن تم نے بھی کمال کر دیا، یہ بھی بہت کام کی چیز نظر آتا ہے۔" موٹے استاد نے لڑکی اور محمود کو باری باری گھورتے ہوئے کہا۔

"ہم سب آپ کے شکرگزار ہیں استاد۔" ٹھیکا نے کہا

"خیر، ٹامی اب ان دونوں کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کرو، آج کافی کام ہو گیا۔"

"بہت بہتر استاد۔" ٹامی بولا، پھر فارے کی طرف مڑا، لیکن ابھی کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ محمود بول پڑا۔

"کیا ارادے ہیں دوستو!"

"یار ٹھیکے! یہ لڑکا عجیب ہے۔" استاد نے واقعی حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں استاد! اس میں کیا عجیب بات ہے، جیسے عام لڑکے

ہوتے ہیں، ایسا ہی یہ ہے۔" ٹامی بولا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نہ یہ رویا، نہ گھبرایا، الٹا ہم سے دلیرانہ انداز میں سوال پوچھ رہا ہے کہ ہمارے کیا ارادے ہیں۔" استاد نے کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ ضرورت سے زیادہ دلیر ہو، لیکن کیمپ میں چل کر اس کی ساری دلیری دھری رہ جائے گی۔" ٹھیکا بولا۔

"کیمپ!" یہ لفظ محمود کے ذہن میں زور سے گونجا اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ابھی تک اسے کچھ کرنے یا فرار ہونے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا اور نہ اس نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی، لیکن کیمپ کا لفظ سن کر اس نے پہلی بار گھبراہٹ محسوس کی، پھر بھی اس نے خود کو سنبھالا اور آواز کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں کے لیے بہتر یہی ہو گا کہ مجھے اور اس لڑکی کو چھوڑ دو..... ورنہ ہو سکتا ہے مصیبت تمہارے گلے پڑ جائے۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ہمارے لیے مصیبت ثابت ہو گے۔"

"اگر تم میری بات کا یہی مطلب نکالنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔" محمود نے کندھے اچکائے۔

"میرا خیال ہے استاد، یہ ضرورت سے زیادہ خود کو دلیر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بات کچھ بھی نہیں ہے۔" فارے نے کہا۔

تمہارا خیال ٹھیک ہے، بہرحال تم لوگ جلد از جلد ان لوگوں کو لے
جاؤ۔ ایسا نہ ہو، شہر میں ان کی تلاش شروع ہو جائے اور تلاش
کرنے والی کوئی پارٹی اس طرف بھی نکل آئے.... میں بھی کل تک تم
سے آ ملوں گا..... تاکہ ہم کسی اور شہر کا پروگرام بنائیں، یہاں کی
باری تو اب کئی روز بعد آئے گی۔"

"بہت بہتر استاد!" تامی اور فارے نے ایک ساتھ کہا، پھر ڈرائیور
اور تینوں غنڈوں کو اشارہ کیا، انھوں نے ایک بار پھر چاقو نکال لیے،
ٹیکا نے پستول ہاتھ میں لے لیا۔

"ذرا تم نے حرکت کی نہیں اور یہ چاقو تمہارے جسموں میں اترے
نہیں، تم دونوں ابھی نہیں جانتے کہ ہم کس قدر سنگدل ہیں۔ رحم ہمارے
دلوں کے پاس سے بھی نہیں گزرا اور نہ کبھی گزرے گا، بس یوں سمجھ
لو کہ رحم پر ہمارے دلوں کے پاس سے گزرتے ہوئے کپکپی طاری
ہو جاتی ہے۔"

لڑکی بُری طرح سہم گئی، محمود کا بھی رنگ اڑ گیا تھا، اب وہ سوچ
رہا تھا کہ اس نے فرار ہونے کی کوشش نہ کر کے غلطی کی ہے۔

وہ ان دونوں کو ساتھ لے کر اس دروازے کی طرف چل پڑے
جس سے اندر آئے تھے۔ چیختی گراری اور باہر نکل آئے۔ ان کے علاوہ
دور دور تک کسی انسان کا پتا نہ تھا، سورج غروب ہو چکا تھا۔
محمود اور لڑکی کو سفید کار میں بٹھایا گیا۔ تامی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال

لی۔ فارا ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا، کھلا چاقو اب بھی اس کے
ہاتھ میں تھا۔ ٹیکا اور تینوں غنڈے ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکا ڈرائیونگ
سیٹ پر جا بیٹھا۔

"ٹیکا! تم ہمارے پیچھے آؤ گے، اگر تعاقب کا شبہ ہو تو فوراً ہمیں
اشارہ دینا۔" تامی نے کہا۔

"راستے میں اگر پولیس کا کوئی آفیسر گاڑی روکے اور تم سے سوال
کرے تو تم یہی جواب دو گے کہ ہم تمہارے بڑے بھائی ہیں اور
سرحدی شہر تک اپنے عزیزوں سے ملنے جا رہے ہیں، اگر تم نے اس
کے خلاف کوئی لفظ منہ سے نکالا تو کھلا ہوا یہ چاقو تم دونوں کی
پسلیاں کاٹ کر رکھ دے گا، پولیس آفیسر سے تو ہم سمجھ ہی لیں گے
چلو تامی۔" فارے نے سرد ترین آواز میں کہا۔

محمود اور لڑکی نے اپنے جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑتی
محسوس کیں۔

کیمپ آگیا ہے

سوا پانچ بجے پر انسپکٹر جمشید پریشان ہو گئے۔ محمود کو تو ٹھیک پانچ بجے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا، پندرہ منٹ کی دیر ان کا اطمینان اڑا دینے کے لیے کافی تھی۔

"میرا خیال ہے، محمود کسی الجھن کا شکار ہو گیا ہے، مجھے گھر سے نکل کر دیکھنا ہی ہو گا۔"

"اوہ!" بیگم جمشید نے پریشان ہو کر کہا۔

"ٹھہرو! پہلے میں ان دونوں سے پوچھ لوں، شاید وہ کچھ کہہ کر گیا ہو۔"

فاروق اور فرزانہ بیماری کی وجہ سے میز پر نہیں آئے تھے، بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ اس لیے انسپکٹر جمشید کو ان کے کمرے میں آنا پڑا۔

"محمود ابھی تک واپس نہیں آیا، وہ پانچ بجے واپس آنے کے لیے کہہ گیا تھا، اس کا کسی خاص جگہ جانے کا پروگرام تو نہیں تھا؟" انہوں نے اندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں ... بس وہ تو گھومنے کے ارادے سے نکلا تھا۔"

فاروق بولا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو، وہ کس طرف گیا ہو گا؟"

"یا تو وہ نیشنل پارک گیا ہو گا، یا پھر ہائی وے کی طرف اور تیسرا امکان جنگل کی طرف جانے کا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، مجھے یہ تین راستے دیکھنا پڑیں گے اور اس طرح بہت وقت لگے گا، خیر میں اکرام اور حوالدار محمد حسین آزاد کی مدد لیتا ہوں۔"

"اگر آپ اس کی تلاش میں نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی ساتھ لے چلیے۔" فرزانہ نے کہا۔

"اس حالت میں تم کس طرح جا سکو گے۔" وہ بولے۔

"جیپ میں جانا کیا مشکل ہے، جس طرح بستروں میں دبکے ہوئے ہیں، اسی طرح جیپ کی سیٹ پر دبک جائیں گے۔"

"خیر چلو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" انہوں نے فکر مند لہجے میں کہا۔

فاروق اور فرزانہ نے چلنے کی تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگائے۔ اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید اکرام کو ہدایات دے چکے تھے۔ وہ گھر سے نکلے ہی تھے کہ ایک ٹیکسی آتی نظر آئی۔ رخ انہی کی طرف تھا۔ فرزانہ نے اطمینان کا سانس لے کر کہا:

"خدا کا شکر ہے، محمود آ گیا۔"

"ابا جان! ذرا اس کی اچھی طرح خبر لیجیے گا، بیماری میں ہمیں

اس کی وجہ سے باہر نکلنا پڑا۔" فاروق بولا۔

"تم اپنی مرضی سے نکلے ہو، میں نے یا محمود نے تمہیں ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا تھا اور اگر وہ دیر سے آ رہا ہے تو اس کی کوئی معقول وجہ....."

اتنے میں ٹیکسی نزدیک آ چکی تھی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی سواری کو دیکھ کر انسپکٹر جمشید نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا، کیونکہ یہ محمود نہیں، بیگم شیرازی تھیں۔

"خیر تو ہے، آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں، فاروق اور فرزانہ کو تو انفلوئنزا ہے، ایسے میں انہیں کیوں باہر نکال لائے آپ۔"

"انہیں میں نے نہیں، خود انہوں نے باہر نکالا ہے اپنے آپ کو۔" انسپکٹر جمشید پھیکی مسکراہٹ سے بولے۔

"اور محمود..... وہ کہاں ہے؟"

"انہی حضرت کی تلاش میں جا رہے ہیں آنٹی..... گھومنے نکلے تھے جناب، نہ جانے کہاں رہ گئے۔"

"تو محمود اب تک نہیں پہنچا؟" بیگم شیرازی نے کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔ فاروق اور فرزانہ نے بھی انہیں حیران ہو کر دیکھا۔

"میں نے اسے عرفان شاپنگ سنٹر کے باہر ایک ٹیکسی میں بیٹھے دیکھا تھا۔"

"ٹیکسی میں....؟" انسپکٹر جمشید کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

"جی ہاں! میں اس کی طرف بڑھی بھی تھی، لیکن پھر ٹیکسی چل پڑی..... لیکن یہ تو تقریباً ایک گھنٹا پہلے کی بات ہے..... اسے تو بہت پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"تب وہ ضرور کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید جیپ میں بیٹھ گئے۔ فاروق اور فرزانہ نے بھی سوار ہونے میں تیزی دکھائی۔ اب انہیں انفلوئنزا کا کوئی احساس نہیں رہ گیا تھا۔ صرف محمود کا خیال ستا رہا تھا۔

بہت جلد وہ عرفان شاپنگ سنٹر تک پہنچ گئے۔ دروازے پر کھڑے چوکیدار اور آس پاس کے خوانچہ فروشوں سے سوالات کرنے کے بعد بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"پہلے ہم دائیں طرف جائیں گے اور پھر بائیں طرف..... تم دونوں دائیں اور بائیں سائڈوں کا خیال رکھنا..... شاید اس نے ہمارے لیے کچھ نیچے گرایا ہو۔"

"بہت بہتر ابا جان! آپ فکر نہ کریں، کوئی ایسی چیز ہماری نظروں سے بچ نہیں سکتی۔"

ان کی جیپ سڑک پر دائیں طرف چل پڑی۔ آدھ گھنٹے بعد وہ شہری حدود کو پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ چلتے رہے، یہاں تک کہ جنگل شروع ہو گیا، لیکن تین کلومیٹر مزید آگے چل کر

بھی کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کر واپس پلٹے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد وہ پھر اس جگہ پہنچے جہاں سے چلے تھے اور اب انہوں نے بائیں طرف سفر شروع کیا۔ شہری حدود ختم ہونے سے پہلے ہی سورج غروب ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید کو رفتار کم کرنا پڑی، کیونکہ اگر محمود نے کوئی چیز گرائی تھی تو اسے دیکھنے کے لیے رفتار کم کرنا ضروری تھا۔

"اب اور غور سے دیکھنا شروع کرو۔"

"آپ فکر نہ کریں ابّا جان، ہم ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

جنگل ختم ہونے کے کوئی پانچ منٹ بعد فاروق چلا اٹھا:

"ٹھہریے ابّا جان!"

انسپکٹر جمشید نے فوراً بریک لگائے، جیپ رک گئی اور وہ نیچے اتر آئے، لیکن پھر اندھیرے کی وجہ سے انہیں جیپ لوٹانا پڑی۔ اس کی روشنی میں انہوں نے سنہری رنگ کا ایک پنسل تراش چمکتے دیکھا۔ فرزانہ نے جھپٹ کر اسے اٹھا لیا۔

"یہ..... یہ محمود کا ہے۔" اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"یہ تو وہی معلوم ہوتا ہے..... " انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"جی ہاں، ہم اسے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔"

یہ کوئی عام پنسل تراش نہیں تھا، محمود کو ایک ملک کے صدر کی طرف تحفے میں ملا تھا۔ سونے کا بنا ہوا تھا..... اور وہ اسے

پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتے تھے۔

"گویا ہم ٹھیک راستے پر لگ گئے۔ آؤ آگے چلیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

فرزانہ نے پنسل تراش جیب میں ڈال لیا۔ اب انسپکٹر جمشید نے رفتار اور بھی آہستہ کر لی..... تقریباً دس منٹ تک چلتے رہنے کے بعد فرزانہ نے ایک بار پھر چلا کر کہا۔

"ابا جان! وہ رہا محمود کا قلم۔"

لیکن اس بار انہوں نے جیپ نہیں روکی، برابر آگے بڑھتے رہے، یہ دیکھ کر فاروق کو بڑی حیرت ہوئی۔

"کیا آپ اتر کر یہ نہیں اٹھائیں گے؟" اس نے کہا۔

"نہیں، اس طرح وقت ضائع ہو گا، ادھر محمود نہ جانے کس مصیبت میں ہو، یہ تو ہم بعد میں بھی اٹھا سکتے ہیں، یہ چیزیں ہمیں راستہ دکھا رہی ہیں، یہی بہت ہے، محمود نے بہت عقل مندی سے کام لیا ہے۔"

کچھ اور آگے بڑھے تو انہیں ایک پنسل ٹارچ نظر آئی، یہ بھی محمود کی تھی..... اب ان پر جوش کا عجیب سا عالم طاری ہو گیا، انسپکٹر جمشید نے رفتار ذرا بڑھا دی اور پھر انہیں ایک کی رنگ نظر آیا، کی رنگ نظر آنے کے بعد بھی انہیں

کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ آخر انسپکٹر جمشید نے جیپ روک دی اور سوچنے کے انداز میں بولے:

"اب کیا کریں؟"

"واپس کی رنگ کے پاس چلیے؟" فرزانہ نے مشورہ دیا۔

"اس سے بہتر ہے کہ واپس کی رنگ کی طرف چلتے ہوئے ہم دائیں بائیں دیکھتے ہوئے چلیں، شاید کوئی سڑک جنگل میں بھی مڑ رہی ہو...." فاروق بولا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا اور جیپ واپس موڑ لی۔ اب وہ دونوں طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر فاروق چیخا:

"ابا جان! وہ رہی کچی سڑک۔"

وہ نیچے اتر آئے۔ جیپ کو پہلے ہی سڑک سے اتار کر روک لیا گیا تھا۔ تینوں پیدل اس کچی سڑک پر چلنے لگے۔ انسپکٹر جمشید نے ٹارچ روشن کی اور کچے راستے کو بغور دیکھنے لگے پھر بڑبڑائے:

"اس طرف سے دو کاریں گزری ہیں اور آج ہی تھوڑی دیر پہلے گزری ہیں۔"

"جی ہاں! نشانات بالکل تازہ ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"لیکن ابا جان، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی کار پہلے

اس طرف آئی ہو اور پھر واپس گئی ہو۔"

"ہاں! اس کا بھی امکان ہے.... خیر آگے چلو، دیکھتے ہیں، یہ کیا چکر ہے۔"

"یہ چکر تو ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر ہی پڑ گئے ہیں۔" فرزانہ نے برا سا منہ بنایا۔

"بات یہ نہیں، شاید ہم ہی چکروں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"اب تم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے نہ پڑ جانا...... قدم آگے بڑھاؤ۔"

"قدم تو برابر آگے بڑھ رہے ہیں ابا جان!"

اور پھر انہیں وہ مکان نظر آ گیا۔ اس مکان کے سامنے بھی کار کے ٹائروں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے ان نشانات کو بغور دیکھا اور پھر بڑبڑائے۔

"فاروق کا ہی خیال درست ہے، کار کو یہاں سے واپس بھی موڑا گیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اس وقت بھی کار یہاں ہی ہوتی، کیونکہ آگے سڑک نہیں ہے..... اب آؤ..... ذرا اس مکان کے دروازے پر چلیں۔"

مکان کے دروازے پر انہیں ایک تالا نظر آیا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ اب

کیا کریں۔ انسپکٹر جمشید نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور باری
باری چابیاں آزمانے لگے۔ آخر ساتویں چابی لگ گئی۔
"فاروق فرزانہ.... پہلے صرف میں اندر جاؤں گا، یہ دھوکا بھی
ہو سکتا ہے.... تم ادھر ادھر دبک جاؤ اور اگر میری طرف سے
پانچ منٹ تک کوئی اشارہ نہ ملے تو اپنی عقل سے کام لینا۔"
"جی بہتر! عقل سے تو ہم کام لیتے ہی رہتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔
انسپکٹر جمشید نے اس کے جملے پر کوئی دھیان نہ دیا اور دروازہ
آہستہ آہستہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ فاروق اور فرزانہ دروازے
کے پیچھے چھپ گئے۔ تقریباً دو منٹ بعد دروازے میں سے آواز آئی:
"اندر آ جاؤ، یہاں کوئی نہیں ہے۔"

○

چند سیکنڈ تک محمود اور وہ لڑکی سکتے کے عالم میں ایک دوسرے
کی طرف دیکھتے رہے۔ لڑکی کا رنگ ہلدی کی مانند زرد پڑ گیا تھا، آخر
محمود نے سوچا، یہ صورتِ حال تو درست نہیں، اس طرح تو وہ خطرے
میں اور زیادہ گھر جائیں گے۔ چنانچہ اس نے اپنے اوسان بحال کیے،
سر کو ایک جھٹکا دیا اور بولا:
"ہم وہی کریں گے جو تم کہو گے، لیکن ہمیں اتنی تو اجازت دو
کہ ہم آپس میں بات چیت کر سکیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے، ہم خود بھی تمہیں باتیں کرتے ہوئے
سننا چاہتے ہیں، اس طرح راستہ بھی آسانی سے کٹ جائے گا۔" نامی
نے خوش ہو کر کہا، خارا منہ بنا کر رہ گیا، بولا کچھ نہیں، شاید
اسے نامی کی بات پسند نہیں آئی تھی۔
"کیا میں آپ کا نام معلوم کر سکتا ہوں....؟" محمود لڑکی سے بولا۔
"میرا نام شاکرہ ہارون ہے۔" اس نے ہکلا کر کہا۔
"شاکرہ ہارون....!" محمود بڑبڑایا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر
سرسری لہجے میں بولا۔
"تو آپ ان ہارون صاحب کی بیٹی ہیں جو شمشان روڈ پر
رہتے ہیں؟"
"اوہو، آپ انہیں جانتے ہیں؟"
"جی ہاں، میرے والد ان سے بہت اچھی طرح واقف ہیں....
میرا نام محمود احمد ہے، ان حالات میں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ
مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی، بہرحال.... خدا کرے کہ ہمارا اس
طرح ملنا بہتری کی صورت پیدا کر دے۔" یہ کہہ کر محمود نامی
کی طرف مڑا۔
"جناب! معاف کیجیے گا، میں نہیں جانتا آپ لوگوں کا
کیا کاروبار ہے اور آپ کے ہمارے بارے میں کیا ارادے ہیں،
لیکن میں یہ ضرور آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ چاہیں

تو شمائلہ ہارون صاحب کے والد آپ کو ان کے بدلے میں اتنی دولت دے سکتے ہیں کہ آپ اسے دونوں ہاتھوں سے بھی لٹائیں تو بھی ختم نہ ہو، میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کسی دوسرے طریقے سے زیادہ دولت کما سکتے ہیں، لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ انہیں ان کے والدین کے حوالے کردیں اور بدلے میں ان سے منہ مانگی دولت وصول کرلیں۔"

"اوہو! یہ اتنے دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔" فارے نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! سر ہارون شہر کے دولت مند ترین انسان ہیں، یہ ایک اتفاق ہے کہ ان کی بیٹی آپ کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ لہٰذا اس موقعے سے فائدہ اٹھائیں۔"

"نہیں! ہم ایسا کبھی نہیں کرتے اور نہ کریں گے، کیونکہ اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے، ہم وہی کام کریں گے جس میں کوئی خطرہ نہیں، ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا....۔" ٹامی بولا۔

"پھر بھی ٹامی.... باس سے ذکر کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

"باس بھی اسے پسند نہیں کریں گے۔" ٹامی نے کہا۔

"خیر! جیسے تمہاری مرضی۔" محمود نے کندھے اچکائے اور پھر شمائلہ ہارون کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"آپ ان کے قبضے میں کیسے آگئیں؟"

"میں عرفان شاپنگ سنٹر میں کچھ چیزیں خریدنے گئی تھی.... اندر یہ لوگ بھی گھوم پھر رہے تھے، اچانک میری کمر میں کوئی تیز نوک دار چیز چبھنے لگی، ان میں سے ایک نے سرگوشی کی، خبردار تمہاری کمر میں چاقو کی نوک چبھ رہی ہے، اگر شور مچانے کی کوشش کی تو پورا خنجر جسم میں گھونپ دیا جائے گا، میں سکتے میں رہ گئی، اس وقت یہ سمجھی کہ یہ جیب کترے ہیں، لیکن پھر انہوں نے مجھے باہر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا، میں شاپنگ سنٹر سے باہر نکل آئی، یہ میرے ساتھ ساتھ باہر آئے اور کار میں بٹھا کر اس مکان میں لے آئے۔"

"کیا آپ گھر سے اکیلی نکلی تھیں؟" محمود نے پوچھا۔

"ڈرائیور کو ساتھ لے کر نکلی تھی، ڈرائیور کی بیوی بیمار تھی، وہ مجھ سے تھوڑی دیر کی اجازت لے کر اپنے گھر چلا گیا، خیال یہ تھا کہ مجھے شاپنگ سنٹر میں ایک گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا.... چنانچہ وہ ایک گھنٹے کے بعد آیا ہوگا اور اب تو میری تلاش بھی شروع کی جا چکی ہوگی، اف میری امی کا کیا حال ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھر رونے لگی۔

"رونے دھونے سے اب کچھ نہیں ہوگا، ابھی حالات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔" محمود نے کہا۔

"اور آپ کیسے پھنس گئے، کیا آپ بھی دولت مند باپ کے

جیسے ہیں"۔

"میں تو ایک ملازم پیشہ باپ کا بیٹا ہوں.... آپ کو شاپنگ سنٹر سے خوفزدہ حالت میں نکلتے دیکھ کر مجھے شک ہو گیا اور میں نے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر سفید کار کا تعاقب کیا، اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور بھی ان کا آدمی ہے اور ٹیکسی بھی ان کی اپنی ہے"۔ محمود کے لہجے میں حسرت تھی، یاس تھی، ناامیدی تھی۔

"کیا ہم ناامید ہو جائیں"۔ شائکہ نے بھی حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں، امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے، مایوسی گناہ ہے، خدا پر بھروسہ رکھو"۔ محمود بولا۔

"ہا ہا ہا"۔ فارسے نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔ "بہت خوب! محمود صاحب بہت خوب! دراصل تم یہ باتیں اس لیے کہہ رہے ہو کہ ابھی تم نے ہمارا کیمپ نہیں دیکھا، جب کیمپ دیکھ لو گے تو ایسی باتیں بھول جاؤ گے، مایوسی کو اپنا مقدر بنا لو گے اور خدا پر بھروسہ کرنا بھی تمہیں یاد نہیں رہے گا"۔

"یہ نہیں ہو سکتا، میں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا، خدا کی ذات پر کامل بھروسہ کرنا سیکھا ہے"۔

"خیر بھئی! دیکھیں گے تمہارے بھروسے کو اور تمہیں بھی"۔

"مجھے تو خیر تم دیکھ ہی رہے ہو"۔ محمود نے پہلی بار مسکرا کر کہا۔

شائکہ نے اس مسکراہٹ کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ان حالات میں بھی کوئی مسکرا سکتا ہے، یہ اس کے لیے شاید عجیب ترین بات تھی۔ محمود کی نظریں بھی اس کے حیرت زدہ سے چہرے پر پڑیں، یہ ایک بھولی بھالی، معصوم سی لڑکی تھی۔ رنگ صاف ستھرا تھا اور چہرے سے ذہانت اور سلیقہ شعاری ٹپک رہی تھی۔

رات رینگتی رہی، ان کی کار چلتی رہی، آسمان پر تارے ہی تارے تھے، البتہ چاند آج نہیں نکلا تھا، شاید چاند کی ابتدائی یا آخری تاریخیں تھیں.... جب بہت دیر تک بھی کار نہ رکی تو انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان کا سفر کبھی ختم نہ ہو گا.... ساری زندگی کار چلتی رہے گی اور ان کی زندگی ختم ہو جائے گی.... کار کے جھولا جھلانے والے ہچکولوں نے انہیں نیند کی آغوش میں دے دیا اور وہ ان حالات میں بھی سو گئے.... اس سے بے خبر کہ کار کہاں جا کر رکنے والی ہے، کیمپ کہاں ہے اور وہاں کیا ہونا والا ہے۔

ان کی آنکھ تو اس وقت کھلی جب فارسے نے انہیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا.... وہ ہڑبڑا کر اٹھے، دیکھا کہ گاڑی

نکل آیا تھا اور وہ چاروں طرف پہاڑوں سے گھری ایک وادی میں پہنچ چکے تھے۔

"چلو اترو، کیمپ آگیا ہے" شامی کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

نئی بات

دونوں مکان میں داخل ہوئے جن سے گزر کر وہ ایک کمرے میں .... پہنچے، یہ کمرہ ہال نما تھا۔ انسپکٹر جمشید اس کے درمیان میں کھڑے تھے، انہیں دیکھ کر بولے:

"محمود کو یہاں لایا ضرور گیا ہے، لیکن اب نہ وہ یہاں موجود ہے، نہ لانے والے، خدا جانے اب وہ کہاں ہیں"

"کیا آپ کمرے کا پوری طرح جائزہ لے چکے ہیں" فرزانہ نے پوچھا۔

"ابھی نہیں، یہ اندازہ تو میں نے سرسری نظروں سے دیکھنے کے بعد لگایا ہے .... مثلاً فرش پہ گرد ہونے کی وجہ سے محمود کے جوتے کے نشانات صاف نظر آرہے تھے، اس کے علاوہ یہاں ایک لڑکی بھی تھی، یہ زنانہ سیڈنل کے نشانات سے ثابت ہے، ان دونوں کے علاوہ کمرے میں تین چار آدمی اور تھے"

"اگر سرسری معائنے سے آپ نے اتنے اندازے لگا لیے ہیں تو بغور دیکھنے کے بعد تو نہ جانے کیا کچھ معلوم کرلیں" فاروق

مسکرا کر بولا۔

"یہ ضروری نہیں، ہو سکتا ہے۔ بغور معائنہ کرنے کے بعد ایک بات بھی اور معلوم نہ کر سکوں، خیر آؤ، دیکھتے ہیں۔"

تینوں ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگے کرسیوں اور میزوں کے علاوہ ایک کونے میں نائیلون کی رسی کے کچھ ٹکڑے بھی موجود تھے۔۔۔ انسپکٹر جمشید کمرے کے ایک ایک انچ کو بغور دیکھنے لگے۔ فاروق اور فرزانہ بھی یہی کچھ کر رہے تھے۔ آخر کافی دیر بعد انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں بھئی! کیا کچھ اندازے لگا پائے ہو تم؟"

"ابا جان! میں ایک بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہاں اس سے پہلے بھی کچھ لڑکوں یا لڑکیوں کو لایا جاتا رہا ہے، رسیوں کے یہ ٹکڑے ظاہر کرتے ہیں کہ ان سے باندھنے کا کام لیا جاتا رہا ہے، ہو سکتا ہے، محمود اور اس لڑکی کو بھی باندھا گیا ہو۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ رسیوں کے ٹکڑے اسی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور کوئی بات؟"

"کار کا یہاں تک آنا، محمود اور اس لڑکی کی یہاں موجودگی اور پھر کار واپس جانے کے نشانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مجرموں کا عارضی ٹھکانا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مجرم کس قسم

کے لوگ ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"مجھے تو یہ اغوا کرنے والوں کی قسم سے نظر آتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"بالکل ٹھیک۔۔۔ اور اب ہو سکتا ہے، اس لڑکی کے ماں باپ اور مجھ سے رقم کا مطالبہ کیا جائے۔ خیر اگر ایسا ہوا تو مزا آ جائے گا، میں ان لوگوں کو بہت بری سزا دوں گا، خیر تمہارے اندازے یہاں تک بالکل درست ہیں، کوئی اور بات بھی بتا سکتے ہو؟"

"جی بس، ہم نے تو یہی اندازے لگائے ہیں۔"

"تو پھر سنو! کمرے میں موجود آدمیوں میں سے کم از کم ایک آدمی ایسا تھا جو میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا، وہ آدمی بہت موٹا تھا اور شاید وہی ان کا سردار تھا۔"

"آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت موٹا تھا؟"

"کرسی کے پاؤں کے آس پاس کے نشانات کو دیکھ کر یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے، کرسی گھسیٹنے کے نشانات فرش پر بہت زیادہ نمایاں ہیں اور اتنے نمایاں نشانات کسی ہلکے پھلکے آدمی کے بیٹھنے سے پیدا نہیں ہو سکتے، اگر یقین نہیں تو خود بیٹھ کر کرسی گھسیٹ کر دیکھ لو۔"

"چلیے ہم نے مانا کہ وہ بہت موٹا تھا، اور کچھ؟" فرزانہ نے کہا۔

"اور کچھ بھی، یہ میز بتاتی ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی! کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا وہ آدمی

ایک خاص عادت کا مالک ہے اور وہ عادت یہ ہے کہ اپنے ناخن یا کسی تنکے سے نوکا ضرور لگتا رہتا ہے۔ اس میز کی سطح پر گرد جم گئی ہے اور اس گرد پر نوکے بے شمار نشان نظر آ رہے ہیں۔"

"بہت خوب! لیکن ان سب باتوں سے ہمیں کیا فائدہ پہنچتا ہے، سوال تو یہ ہے کہ ہم محمود کے لیے کیا کریں۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہم یہ سب کچھ اسی کے لیے کر رہے ہیں۔ وہ لوگ محمود اور لڑکی کو لے کر یہاں سے جا چکے ہیں اور اب ہمیں ان کے پیچھے روانہ ہونا ہے۔"

"لیکن ہمیں یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ وہ کس طرف گئے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"عقل سے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔" فرزانہ جل کر بولی۔

"چلو خدا کا شکر ہے کہ تمہارے پاس تو ہے، ورنہ ہم تو مر گئے تھے بے موت۔" فاروق نے بھی جل کر کہا۔

"بے موت بھی بھلا کوئی مرا ہے۔"

"تو یہ محاورہ غلط ہوگا پھر۔" فاروق بولا۔

"آؤ چلیں، شاید ہمیں ابھی کافی سفر کرنا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے ان کی باتوں پر توجہ دیے بغیر کہا۔

وہ باہر نکلے، کچی سڑک سے ہوتے ہوئے سڑک پر آئے۔ سڑک

کے دائیں اور بائیں عمارتوں کے نشانات کا بغور جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"وہ کار جس پر انہیں لایا گیا، بلکہ دوسری کار بھی جو شاید نگرانی کے لیے پیچھے تھی، ان کے نشانات آگے بھی موجود ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ وہ واپس شہر جانے کی بجائے آگے گئے ہیں۔ یوں بھی شہر سے انہیں یہاں لا کر واپس شہر لے جانا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔"

"ابا جان! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ محمود اور وہ لڑکی اب مکان میں ہی کہیں قید ہوں اور صرف اغوا کرنے والے یہاں سے رخصت ہوئے ہوں۔" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

"تمہارا مطلب کسی تہہ خانے سے ہے؟"

"جی ہاں!"

"ہوں..... اس کے لیے ہمیں مکان کے نزدیک کی جگہ ایک بار پھر دیکھنا ہوگی، تمہیں یہ خیال پہلے دلانا چاہیے تھا۔ خیر..... آؤ، ہم کوئی کسر چھوڑنا پسند نہیں کریں گے۔"

وہ واپس مڑے اور مکان کے پاس پہنچے۔ ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے قدموں کے نشانات کا بغور جائزہ لیا۔ محمود اور لڑکی کے قدموں کے نشانات کا بغور جائزہ لیا۔ محمود اور لڑکی کے قدموں کے واپس جاتے ہوئے نشانات صاف نظر آتے تو وہ [illegible] سے [illegible] گئے۔

"بس اب ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" [illegible]

لگ انہیں لے کر دور نکل جائیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور تینوں تیز
تیز چلتے اپنی جیپ تک آئے۔ ایک بار پھر ان کی جیپ چل پڑی۔
اب رفتار بہت تیز تھی..... فاروق اور فرزانہ کے دل دھک دھک
کر رہے تھے۔ محمود کا اغوا ان کے لیے حد درجے پریشان کن بات
تھی، لیکن ان کے مقابلے میں انسپکٹر جمشید اس قدر فکر مند نہیں تھے،
بس ذرا پریشان ضرور تھے، لیکن پھر ان کی پریشانی میں بھی اضافہ ہی
ہوتا چلا گیا، کیونکہ نہایت تیزی سے جیپ چلانے کے باوجود ابھی
تک کسی آبادی کا نشان نظر نہیں آیا تھا، وہ اس سڑک پر زندگی میں
پہلی بار آئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ سڑک انہیں کہاں لے
جائے گی، تاہم انہوں نے رفتار کم نہیں کی، برابر بڑھتے چلے گئے
..... یہاں تک کہ دن کا اجالا پھیلنے لگا، تاریکی چھٹنے لگی، اُبھرتے سورج
کا کنارہ نظر آیا اور پھر سونے کا تھال پورا نظر آنے لگا..... اس کے
ساتھ ہی انہیں ایک شہر کے آثار نظر آنے لگے، یہ دیکھ کر ان
پر ایک بار پھر جوش کی حالت طاری ہو گئی، ناامیدی کے بادل چھٹنے
لگے، انہیں یوں لگا جیسے منزل قریب آ گئی ہے، شہر کی حدود میں
داخل ہوتے ہی انسپکٹر جمشید بڑبڑائے:

"ارے! یہ تو شاید سرحدی شہر علی آباد ہے۔"

"کیا آپ کبھی اس شہر میں نہیں آئے؟"

"اتفاق نہیں ہوا۔" انہوں نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، پھر بازار نظر
آنے لگے..... آخر ایک ہوٹل کے سامنے پہنچ کر انہوں نے جیپ
روک لی۔

"ہمیں یہاں رک کر اس شہر کے حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔
خدا جانے وہ اس شہر میں کہاں ہوں گے۔"

"لیکن ابا جان! اگر انہوں نے محمود اور لڑکی کی واپسی کے لیے
رقم کا مطالبہ کیا تو امی جان انہیں کیا جواب دیں گی، ہم تو ان
سے کچھ بھی نہیں کہہ کر آئے۔" فاروق کو اچانک خیال آیا۔

"فکر نہ کرو، میں ابھی فون پر ان سے اور اکرام سے بات
کرتا ہوں۔"

ہوٹل کے دو ملازم ان کی جیپ رکتے دیکھ کر ان کی طرف
لپکے، لیکن بھلا ان کے پاس سامان کہاں تھا، انسپکٹر جمشید انہیں
دیکھ کر مسکرائے اور بولے:

"ہمارے پاس کوئی سامان نہیں ہے، لیکن ہمیں ٹھہرنے کے لیے
دو کمرے ضرور چاہییں۔"

"تشریف لایئے جناب! یہاں ہر چیز ملے گی۔"

"کیا فون کی سہولت بھی ہے؟"

"جی ہاں! کیوں نہیں۔"

"بہت خوب۔ آؤ بھئی۔"

کاؤنٹر کلرک نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا اور فوراً ہی ان
کے نام رجسٹر میں درج کرنے کے بعد ایک بیرے کے ساتھ اوپر
والی منزل پر بھیج دیا۔ انہیں گیارہواں اور بارہواں کمرہ دیا گیا تھا۔
ہوٹل تین منزلہ تھا، لیکن چھوٹا سا تھا۔ ہر منزل پر صرف دس کمرے
تھے۔ البتہ نیچے ہال کافی بڑا اور خوبصورت تھا۔ فون ہر کمرے
میں موجود تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے کاؤنٹر کلرک سے فون
پر یہ معلوم کیا کہ دارالحکومت میں فون کے لیے پہلے کیا نمبر ڈائل کرنا
پڑتا ہے۔ اس نے سات کا ہندسہ بتایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ
گھر کے نمبر ڈائل کر رہے تھے۔ فوراً ہی بیگم جمشید کی پریشان
سی آواز سنائی دی:

"ہیلو! کون صاحب ہیں، میں بیگم جمشید بول رہی ہوں۔"

"بیگم یہ میں ہوں۔"

"اُف خدا...... آپ نے رات بھر مجھے کتنا پریشان رکھا،
فون ہی کر دیا ہوتا۔"

"بیگم، ساری رات جنگل میں سفر کرنا پڑا، اور جنگل میں تم جانتی
ہی ہو کہ فون نہیں لگے ہوتے۔" انسپکٹر جمشید نے خوش گوار لہجے
میں کہا۔

"محمود کا کیا رہا، کیا کچھ پتا چلا؟"

"ہاں! ہم مجرموں کے تعاقب میں ہیں، فکر کرنے کی کوئی

ضرورت نہیں، اور ہاں..... یہاں تو کوئی نئی بات نہیں ہوئی؟"
انہوں نے پوچھا۔

"نئی بات..... کیا مطلب؟"

"کوئی فون تو نہیں آیا محمود کے بارے میں، کوئی مطالبہ وغیرہ؟"

"جی نہیں! ایسی تو ابھی کوئی بات نہیں، البتہ اکرام کا فون
کئی بار آ چکا ہے۔ وہ بہت بوکھلایا ہوا پھر رہا ہے، پتا نہیں
کیوں، محمود کی پریشانی میں [illegible] پتا نہیں۔"

"خیر! میں اسے فون کیے لیتا ہوں، ہاں اگر اس قسم کا کوئی
فون آئے تو یہی کہنا کہ ہم گھر میں موجود نہیں ہیں، آنے پر پیغام
دے دیا جائے گا، اور پھر ہمیں فون پر اطلاع دے دینا۔"

"آپ کہاں اور کس نمبر سے بات کر رہے ہیں؟"

"ہم اس وقت سرحدی شہر علی آباد کے ہوٹل نور افشاں میں
ٹھہرے ہوئے ہیں، کمرہ نمبر گیارہ اور بارہ میں.... جب چاہو فون
پر بات کر سکتی ہو۔"

"کیا آپ کو امید ہے کہ محمود تک پہنچ جائیں گے؟"

"ہاں! ان شاء اللہ۔" یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ بند کیا اور پھر دفتر
کے نمبر ڈائل کیے۔ چپڑاسی نے فون اٹھایا۔ انہوں نے اسے ہدایت
کی کہ اکرام کو فون پر بلا دے۔ سب انسپکٹر اکرام، جو دفتر کے کمرے
میں رہتا تھا۔ چند منٹ بعد اکرام فون پر کہہ رہا تھا:

"اُف خدا.... آپ کہاں ہیں، یہاں قیامت آئی ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"سر ہارون کی بیٹی شائلہ کو اغوا کر لیا گیا ہے.... سارے شہر کی پولیس اور ہمارے محکمے کے آفیسر تک اس کی تلاش میں تمام رات مارے مارے پھرتے رہے ہیں، سر ہارون کے صدرِ مملکت سے خصوصی تعلقات ہیں، لہٰذا تمام آفیسروں کی جان پر بنی ہے.... آپ کو بھی بار بار فون کیا گیا، لیکن آپ کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا، گھر سے یہ بتایا گیا کہ محمود اچانک کہیں غائب ہو گیا ہے اور آپ لوگ اس کی تلاش میں گئے ہیں، میں نے بھی آئی جی صاحب کو یہی بتایا کہ آپ نے مجھے اور حوالدار محمد حسین آزاد کو دو مختلف سڑکیں چیک کرنے کے لیے بھیجا تھا، لیکن جب کوئی سراغ نہ ملا تو ہم واپس آ گئے اور واپس آتے ہی سر ہارون کی بیٹی کی مصیبت نے ہمیں گھیر لیا۔" یہاں تک کہہ کر اکرام خاموش ہو گیا۔

"اوہو تو یہ بات ہے، کیا سر ہارون کو کوئی فون موصول ہوا ہے، میرا مطلب ہے، اغوا کرنے والوں نے ان سے اب تک کوئی مطالبہ کیا ہے؟"

"جی نہیں، ابھی تک ایسا کوئی فون موصول نہیں ہوا۔ تاہم سبھی انتظار کر رہے ہیں.... آپ سنائیے، آپ کہاں پہنچ چکے ہیں؟"

"میں محمود کو اغوا کرنے والوں کے تعاقب میں ہوں، شاید محمود اور شائلہ کو اغوا کرنے والے ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہو سکتا ہے، جب میں محمود تک پہنچوں تو وہاں شائلہ بھی موجود ہو۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو، ورنہ سر ہارون تو ہماری زندگی اجیرن کر دے گا۔"

"تم فکر نہ کرو، اور میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاؤ کہ میں کہاں ہوں.... نہ میں تمہیں بتا رہا ہوں، تاکہ تمہیں جھوٹ نہ بولنا پڑے.... کیونکہ اگر میں نے بتا دیا تو سب تلاش کرنے والے یہاں آ دھمکیں گے اور پھر ہم شاید اغوا کرنے والوں کو کبھی نہ پا سکیں، اس صورت میں محمود اور وہ لڑکی بھی ہمیں زندہ نہیں ملیں گے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔"

"تو بس پھر، میرے بارے میں چپ سادھ لو، آئی جی صاحب بھی پوچھیں تو کچھ نہ بتانا۔"

"جی بہتر۔" اکرام نے کہا اور انہوں نے فون بند کر دیا۔

"تو وہ لڑکی سر ہارون کی بیٹی ہے۔" فون کا ریسیور رکھتے ہوئے وہ بولے۔ "کم بختوں نے بہت بڑا ہاتھ مارا ہے۔"

"اور میرا خیال ہے، محمود ان کے درمیان اس لڑکی کو بچانے

کے پیچھے پھنس گیا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"یہ ضروری نہیں کہ یہ وہی لڑکی ہو جو ان لوگوں کے ساتھ تھی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شاکر ہارون کو کسی اور گروہ نے اغوا کیا ہو۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آج کل اغوا کرنے والے بڑی تیزی سے پیدا ہو رہے ہیں.... اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"بس دیکھتے جاؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی بہتر، دیکھتے جائیں گے۔" فاروق مسمسی صورت بنا کر بولا۔

"ان حالات میں تمہارا مذاق کرنا مجھے ایک آنکھ نہیں بھا رہا۔" فرزانہ نے برا سا منہ بنایا۔

"بھئی مجھے حیرت ہے۔ حالات بھی کچھ رہے ہیں اور پھر میرا مذاق ان حالات میں کیا، حالات کچھ بھی کیوں نہ ہوں، تمہیں کبھی ایک آنکھ سے بھایا نہ دو آنکھوں سے۔"

"اچھا بس.... اب ہم نیچے چل کر ناشتا کریں گے۔"

ناشتے کے بعد انسپکٹر جمشید اٹھ کر کاؤنٹر پر گئے اور کلرک سے بولے:

"ہم یہاں سیر کرنے کے لیے آئے ہیں، کیا یہاں سے شہر کا کوئی نقشہ مل سکتا ہے؟"

"جی ہاں! سیر کی غرض سے آنے والوں کے لیے ہم نے خاص

طور پر نقشوں کا انتظام کیا ہے، بلکہ اگر آپ پسند کریں تو گائیڈ بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔"

"فی الحال ہمیں گائیڈ کی ضرورت نہیں، اگر محسوس ہوئی تو آپ سے کہہ دوں گا.... آپ ایک عدد نقشہ مرحمت فرمائیں۔"

نقشہ لے کر وہ پھر میز پر آئے اور اسے پھیلا کر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے پنسل نکال لی اور اس کی نوک سے نقشے کے مختلف مقامات پر نشانات لگانے لگے.... ساتھ ساتھ وہ بڑبڑا بھی رہے تھے۔

"یہ ہے، وہ سڑک جس کے ذریعے ہم اس شہر میں داخل ہوئے ہیں.... اگر ہم اسی سڑک پر آگے چلتے رہیں تو دشمن ملک کی سرحد آجاتی ہے، سرحد پر ہمارے فوجی موجود ہیں، لہذا اس طرف سے تو ان کے فرار ہونے کا کوئی امکان نہیں.... اب رہی یہ سڑک.... یہ پہاڑیوں کی طرف لے جاتی ہے، ان پہاڑیوں میں ہو سکتا ہے کوئی راستہ ایسا ہو جس کے ذریعے وہ فرار ہو سکتے ہوں، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کا ارادہ ملک سے فرار ہونے کا ہی ہو، بہرحال دیکھیں گے، تیسری سڑک بلتستان کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمیں ان تینوں سڑکوں کی آخری حد تک دیکھنا ہوں گی، سب سے پہلے ہم سرحد کی طرف جائیں گے۔"

سرحد کے ایک فوجی آفیسر سے ملاقات کے بعد انہیں تعین ہو

گیا کہ اغوا کرنے والے اس طرف ہرگز نہیں آئے۔ اب انھوں نے ریگستان کی طرف جانے والی سڑک کا رخ کیا۔ ریگستان جب شروع ہوا تو جیپ سے اتر کر قدموں کے نشانات کا جائزہ لیا گیا۔ اسکار کے ٹائروں کے نشانات تلاش کیے گئے، لیکن کہیں کوئی نشان نظر نہ آیا۔

"اس کا مطلب ہے، وہ پہاڑیوں کی طرف ہی گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے پر یقین لہجے میں کہا۔

"تو پھر چلیے.... شاید ہم منزل تک پہنچنے ہی والے ہیں۔" فرزانہ نے پر جوش انداز میں کہا۔

انھوں نے جیپ موڑ لی اور پہاڑی سڑک پر روانہ ہو گئے۔ دور سے پہاڑیاں سرمئی رنگ کی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن یہ بالکل بنجر تھیں، ان پر کچھ اگا ہوا نہیں تھا.... جوں جوں وہ پہاڑیوں کے نزدیک ہو رہے تھے، ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھیں.... یہاں تک کہ سڑک ختم ہو گئی اب... ان کے سامنے پہاڑ ہی پہاڑ تھے، وہ جیپ سے اتر آئے اور ادھر سے ادھر تک بغور دیکھنے لگے۔

"ابا جان! ہم پیدل ان پہاڑیوں کا جائزہ کس طرح لے سکیں گے۔" فرزانہ نے مایوس ہو کر کہا۔

"فکر نہ کرو، اگر ہیلی کاپٹر بھی لانا پڑا تو لائیں گے۔"

عین اسی وقت ان کی نظر ایک ٹرک پر پڑی..... ٹرک پہاڑیوں کے درمیان سے نکل کر ان کی طرف آ رہا تھا۔

موت کا راستہ

وہ کار سے نیچے اتر آئے، چاروں طرف دیکھا اور پھر انہیں یوں لگا جیسے ان کے جسموں سے جان نکل گئی ہو۔ اب پہلی بار حقیقت انہیں معلوم ہوئی، یہ اغوا کرنے والے عام لوگ نہیں تھے، خرکار تھے..... اور یہ کیمپ خرکاروں کا کیمپ تھا۔ ان کی عمر کے بے شمار لڑکے اور لڑکیاں سروں پر ٹوکریاں اٹھائے ایک قطار میں ایک طرف جاتے نظر آئے۔ قطار سے آگے ایک لمبا تڑنگا بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی ہاتھ میں چمڑے کا سیاہ رنگ کا کوڑا لیے چل رہا تھا، وہ بار بار اپنے کوڑے کو فضا میں زور سے لہراتا، اس کے لہرانے سے ہوا میں جیسے چیخ پڑتی، ایک عجیب سی سنسنی خیز آواز پیدا ہوتی اور قطار میں چلنے والوں کے دل دہلا کر رکھ دیتی۔ قطار کے درمیان میں بھی ایک کوڑے والا موجود تھا، جب اگلا نگران کوڑا لہرا چکتا تو وہ اپنے کوڑے کو چٹاخ سے پتھریلی زمین پر دے مارتا۔ ایک نگران قطار کے آخر میں تھا، وہ اپنے کوڑے کو مسلسل سر سے اوپر گھما رہا تھا۔

سب لڑکے اور لڑکیاں تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے، ان میں سے جس کے قدم بھی سست پڑتے، کوڑا اس کی طرف فوراً لپکتا اور اس کے ساتھ دو چار اور کے بھی لگتا۔ ان کی چیخیں نکل جاتیں، یہ منظر دیکھ کر شائلہ کی سٹی گم ہو گئی، محمود بھی پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ قطار بہت لمبی تھی اور ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے میں اسے پانچ منٹ لگے۔ اس کے بعد ٹامی اور خارسے نے کہا۔

"یہ نظارہ تمہیں مفت میں دیکھنے کو مل گیا، اب آؤ..... ذرا باس سے ملاقات ہو جائے۔" وہ کار کو وہیں چھوڑ کر ایک طرف کو چل پڑے۔ محمود نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ان کے پیچھے کوئی نگران نہیں تھا۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی، بھاگ کھڑا ہو، لیکن پھر شائلہ اور دوسرے تمام بچوں کا خیال آ گیا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا:

"نہیں ابھی ان کے بغیر بھاگنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

ایک طرف انہیں خاکی رنگ کے کینوس کے خیموں کی ایک بہت لمبی قطار نظر آئی۔ ان میں سے ایک خیمہ سب سے اونچا تھا۔ اس پر سنہری رنگ کی جھالریں بھی لگی ہوئی تھیں جو ہوا سے لہرا رہی تھیں۔ ٹامی، خارسے اور اس کے ساتھی شائلہ اور محمود کو لے کر اسی خیمے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آخر خیمے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اب ٹامی نے نرم اور دھیمی آواز میں کہا:

"باس! ٹامی اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔"
"اجازت ہے۔" اندر سے ایسی آواز آئی جیسی کسی کے گلے سے
چھلنی چھلنی آواز نکلتی ہے۔
ٹامی نے دروازے کا پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہوا۔ باقی
لوگ باہر ٹھہرے رہے۔ چند سیکنڈ بعد ٹامی کا سر پردے سے
باہر نکلا:
"لے آؤ بھئی انہیں اندر۔"
محمود اور شاکر کو آگے دھکیل دینے کے بعد خارا، ٹیکا اور باقی
تین غنڈے اندر داخل ہوئے۔ محمود اور شاکر نے دیکھا، اندر ایک شاندار
کرسی پر ایک پتلا دبلا اور ٹنگ منگ سا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں
بہت چھوٹی تھیں، لیکن ان میں شیطانی چمک تھی۔ اس کی ناک بھی بہت
باریک سی تھی، ہونٹ بالکل باریک تھے، یوں لگتا تھا جیسے دو لکیروں
نے منہ کو بند کر رکھا ہو۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی میز بچھی
تھی۔ اس میز پر ایک بڑا سا پستول، ایک خنجر، ایک آہنی مکا....
اور ایک آہنی شکنجہ رکھا تھا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی
چھوٹی چھوٹی آنکھیں ان پر جم گئیں۔
"بہت خوب! دونوں صحت مند ہیں، کام کی چیزیں ہیں، یہ لڑکا
اب ساری عمر ہمارے کام آئے گا، اور لڑکی بڑی ہو کر وہاں پہنچ
جائے گی، یعنی منڈی میں، اس کے بہت اچھے پیسے ملیں گے۔

منڈی میں بڑھ چڑھ کر اس کی بولی لگائی جائے گی۔"
"انسانوں کی منڈی!" محمود کے منہ سے نکلا۔
"ہاں! ہمیں کچھ ایسی منڈیوں کا علم ہے، جہاں لڑکیاں بکتی ہیں، بکنے
کو لڑکے بھی ہیں، لیکن لڑکوں کی چونکہ خود ہمیں ضرورت رہتی ہے،
اس لیے ہم انہیں فروخت نہیں کرتے...... ٹھیک ہے خارے، تم
ان دونوں کو حفاظتی انتظامات کی ایک جھلک دکھا دو، تاکہ یہ فرار ہونے
کا خیال تک دل سے نکال دیں، اس کے بعد انہیں کسی خیمے میں شامل
کر دینا اور ان کا کام بھی دینا، رجسٹر میں ان کے نام لکھ لینا اور انہیں
یہ بھی بتا دینا کہ کوئی سرکاری آدمی آ ٹپکے تو انہیں کیا بیان دینا ہے۔"
"او کے باس!" خارے نے کہا۔
"باس! خارے نے ایک اور خیال ظاہر کیا تھا۔" اچانک ٹامی
کو خارے کی بات یاد آ گئی۔
"کیا خیال ٹامی؟" باس چونکا۔
"یہ لڑکی ایک بہت بڑے دولت مند باپ کی بیٹی ہے، خارے
کا خیال ہے، اگر آپ اس کے باپ سے لمبی چوڑی رقم کا مطالبہ کریں۔"
"نہیں ٹامی! یہ اغوا کی ایک اور لائن ہے اور ہم اس لائن کے
کھلاڑی نہیں.... لہٰذا مار کھا جائیں گے۔ ہمیں تو اپنا یہی میدان پسند
ہے۔ تم دیکھنا، کوئی عرب شیخ اس کے باپ سے بھی زیادہ اس
کے پیسے دے دے گا۔"

"آپ بہتر سمجھتے ہیں باس، میری رائے یقیناً فضول تھی" خارے نے جلدی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں خارے.... تم میرے بہترین کارکن ہو، تمہیں ایسا مشورہ دینے کا پورا پورا حق ہے، ارے ہاں، استاد کب آ رہا ہے؟"

"آپ کو تو معلوم ہی ہے باس، استاد بہت زیادہ احتیاط کرنے کا عادی ہے، اگلے روز تک اگر جنگل والے مکان کی طرف کوئی نہ آیا تو وہ یہاں پہنچ کر خبر دے گا کہ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں اور اگر کوئی ادھر آ نکلا تو ان کا بندوبست کر کے یہاں آئے گا۔"

"بھئی اس کی یہی باتیں تو مجھے پسند ہیں، میں نے اپنے اردگرد سبھی کام کے آدمی جمع کیے ہیں، اس لیے یہ سارا کاروبار اتنی بے فکری سے ہو رہا ہے۔" باس نے کہا، پھر ایک انگڑائی لے کر بولا۔

"خیر! اب تم لوگ جاؤ اور دیکھو، کسی سے بھی نرمی برتنے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں باس! رحم کا ہمارے ہاں کیا دخل!"

خارے نے شمائلہ کے بال مٹھی میں پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، اس کے ساتھ ہی ٹینکا نے محمود

کو بالوں سے پکڑ لیا اور یہی سلوک کیا، لیکن محمود کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

"تم کیوں نہیں چیخے؟" ٹینکا نے چیخ کر کہا۔

"میں صبر کرنے کا عادی ہوں۔" محمود نے برداشت سے کام لیتے ہوئے کہا ورنہ شمائلہ کی حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"ابھی پتا چل جاتا ہے کہ کتنے صابر ہو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک وحشیانہ جھٹکا مارا اور بے شمار بال محمود کے سر سے اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آ گئے۔ محمود منہ کے بل گرا اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔

"الحمدللہ۔" اس کے منہ سے نکلا۔ ضبط کا یہ عالم دیکھ کر شمائلہ کے ساتھ ٹینکا اور دوسرے بھی حیران رہ گئے۔ پھر کمر کی طرف سے محمود کے کپڑوں کو پکڑ کر اسے اوپر اٹھا کر ایک دھکا باہر کی طرف دیا گیا۔ محمود لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا، ساتھ ہی باس کی آواز اس کے کانوں میں گونجی:

"پہلے اسے حفاظتی انتظامات دکھا دو۔"

شمائلہ کا تو رنگ ہی فق تھا۔ اس کے لمبے بال ابھی تک خارے کے ہاتھ میں تھے، وہ اس کے بالوں کو جھٹکے پر جھٹکا دے رہا تھا اور محمود کو ٹینکا دھکے پر دھکا دے رہا تھا۔ ان کے ساتھ دو تین غنڈے بھی تھے۔ ناٹی باس کے پاس اندر ہی رہ گیا، شاید وہ اس کا خاص آدمی تھا۔ محمود نے خود کو اتنا بے بس شاید کبھی محسوس

نہیں کیا ہو گا۔ وہ بھاگنے کی کوشش کر سکتا تھا، لیکن باس کا یہ جملہ
کہ پہلے حفاظتی انتظامات دکھا دینا، اسے خبردار کر رہا تھا، دوسرے
شاکو اور اس جیسی بے شمار لڑکیوں اور لڑکوں کا سوال بھی اسے پریشان کر رہا تھا۔
اس کے کان شاکو کی چیخیں سنتے رہے، لیکن جوش میں آکر ان
لوگوں سے بھڑ جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اس صورت میں شاکو
کے ساتھ اور زیادہ سختی کی جاتی..... ان تکلیف دہ لمحات کا خاتمہ
پندرہ منٹ بعد ہوا..... اب وہ ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ چکے تھے۔
ٹیلے پر پہنچ کر فارسے نے کہا:
"اب اپنے چاروں طرف بغور دیکھ لو، تمہیں معلوم ہو جائے
گا کہ یہاں سے بھاگنا موت کو دعوت دینا ہے، اور موت بھی کیسی
جس کے خیال سے تم کانپ اٹھو گے۔"
انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ تقریباً ایک مربع کلومیٹر جگہ کے
گرد خاردار تاروں کی باڑھ لگائی گئی تھی، یہ باڑھ تقریباً دس فٹ
اونچی تھی۔ چاروں کونوں پر ایک ایک سائبان سا بنا تھا۔ ہر سائبان
کے نیچے چار چار آدمی مشین گنیں لیے کھڑے تھے۔
"یہ لوگ ایسی جگہوں پر کھڑے ہیں، جہاں سے سارے کیمپ
پر نظر ڈالی جا سکتی ہے، ہر آٹھ گھنٹے بعد ان کی ڈیوٹی بدل دی
جاتی ہے، تاکہ وہ سست نہ پڑیں اور ہر وقت چوکنے رہیں، انہیں
حکم یہ ہے کہ جب بھی کوئی لڑکا یا لڑکی فرار ہونے کی کوشش
کرے، اس کی ٹانگوں میں گولی مار دی جائے، ٹانگوں میں گولی لگنے

کے بعد اس کی مرہم پٹی نہیں کی جاتی، اس سے اسی حالت
میں کام لیا جاتا ہے، اس کا خون بہتا رہتا ہے، یہاں تک
کہ وہ سسک سسک کر مر جاتا ہے، پھر اس کی لاش خاردار
تاروں میں لٹکا دی جاتی ہے، تاکہ سب لڑکے اور لڑکیاں بھاگنے
کے خیال سے بھی عبرت پکڑیں..... بائیں طرف تم ایک لڑکے کو
لٹکا ہوا دیکھ سکتے ہو، کل شام یہ مر گیا تھا، اب تین دن تک
اس کی لاش لٹکی رہے گی۔ پھر اتار کر کسی کھائی میں پھینک
دی جائے گی۔" فیکا کہتا چلا گیا۔
انہوں نے چونک کر بائیں طرف دیکھا، اس طرف انہوں نے
پہلے بھی دیکھا تھا، لیکن اس وقت وہ سمجھے تھے کہ شاید کسی
لڑکے کے کپڑوں میں بھس بھر کر اسے ٹانگ دیا گیا ہے،
لاش کو دیکھ کر شاکو تھر تھر کانپنے لگی، پھر اس کے منہ سے
خوف زدہ انداز میں نکلا:
"نہیں!"
محمود بھی ساکت رہ گیا۔ اس نے سوچا، کیا یہاں سے نکلنے
کا کوئی راستہ نہیں، عین اسی وقت اس نے ایک لڑکے کو
حرکت میں آتے دیکھا، اس پر پتھر لدے ہوئے تھے، وہ لڑکا
خاردار باڑھ کی طرف جا رہا تھا اور اسی وقت انہوں نے دیکھا
..... خاردار تاروں کی اس دیوار میں ایک گیٹ بھی بنایا گیا

تھا۔ اس گیٹ پر بھی شین گنوں والے چار پہرے دار کھڑے تھے
گویا نکلنے کا یہی ایک راستہ تھا..... لیکن یہ راستہ موت کا راستہ تھا۔

"اب اگر تم معائنہ کر چکے ہو تو آؤ، ہم تمہیں کسی قیدی تک
چھوڑ آئیں، وہاں تمہارے ساتھی تمہیں بتا دیں گے کہ یہاں کیا
کرنا پڑتا ہے..... ایک آدھ دن کے اندر ہی تم کام میں اتنے
ماہر ہو جاؤ گے کہ تمہیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا، تم
اناڑی ہو، بلکہ یہی کہے گا، شاید تم پیدا ہوتے ہی یہ کام کرنے
لگے تھے۔" خارے کے لہجے میں بلا کی درندگی تھی۔

ایک بار پھر انہیں دھکیلا جانے لگا۔ محمود کو انسانیت
کی اس بے بسی اور بے کسی پر رونا آ گیا۔ اس نے شائلہ
کی طرف دیکھا، وہ بُری طرح سسکیاں لے رہی تھی، اس نے
بھلا کب اتنی تکلیف اٹھائی تھی۔ تاہم اسے محمود کی آنکھوں
میں آنسو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔

"مسٹر محمود! آپ بھی رو پڑے، میرا تو خیال تھا، آپ
نہیں روئیں گے۔"

"میں اپنی تکلیف پر نہیں، اس ظلم پر رو رہا ہوں جو انسان
کے بچوں پر توڑا جا رہا ہے، آخر ایسا کیوں ہے، اس علاقے کے
قانون کے محافظ کیا ہوئے، ان کے کانوں پر جوں کیوں نہیں رینگتی
انہیں کیا ہو گیا ہے، کیا ان تک ایسی کوئی بات، کوئی خبر، کوئی

افواہ نہیں پہنچی..... کیا وہ صرف اس وقت حرکت میں آئیں گے
جب خود ان کا کوئی بچہ یہاں پہنچ جائے گا۔"

"ہا ہا ہا" خارے نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، پہاڑیاں
اس کے قہقہے سے گونج اٹھیں۔ "قانون کے محافظوں کے فرشتوں کو
بھی خبر نہیں کہ یہاں کیا ہوتا ہے، وہ تو صرف یہی جانتے ہیں کہ
ہمارے باس کو اس علاقے کی پہاڑیوں کا ٹھیکہ ملا ہوا ہے، بارودی
سرنگیں بچھا کر ان پہاڑیوں کو اڑایا جاتا ہے اور پھر بڑے بڑے
پتھروں کو چھوٹے چھوٹے پتھروں میں تبدیل کرنے اور پھر ان
ٹرکوں پر لادنے کا کام ان لڑکوں اور لڑکیوں سے لیا جاتا ہے،
زیادہ نہیں..... صرف صبح سورج نکلنے سے لے کر غروب ہونے
تک کام لیتے ہیں اور اس کے بدلے میں دن میں تین بار کھانا
دیا جاتا ہے، اس سے زیادہ نرم سلوک اور کیا ہو سکتا ہے،
ہاں! اتنا ہے کہ یہاں جو ایک بار آ گیا، واپس اپنے گھر نہیں
جا سکا، پورے کیمپ کی تاریخ میں صرف دو لڑکوں اور
ایک لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن انہیں ان تاروں پر
لٹکنا پڑا۔ آخری واقعہ آج سے دو دن پہلے ہوا..... ابھی تم
نے جس لڑکے کی لاش کو لٹکے ہوئے دیکھا ہے، وہ وہی تھا،
بس ذرا گولیاں اس کی ٹانگوں کی بجائے اوپر والے دھڑ
میں لگ گئیں اور وہ فوراً ہی مر گیا جس کا ہمیں بہت

افسوس ہوا، دو چار دن اس کے تڑپنے کا نظارہ بھی نہ کر سکے۔"
اس کے لہجے میں ایک ایسی بے حسی تھی جو اچھوں اچھوں کو ہلا
دے۔ شمائلہ پہلے ہی حد درجے سہمی ہوئی تھی، اس کا یہ بیان
سن کر بدن میں تھرتھری دوڑ گئی، تاہم محمود نے بڑی مشکل
سے خود کو سنبھالا۔

خیموں کی قطار شروع ہو گئی تھی۔۔۔ اس وقت تمام خیمے
خالی تھے۔ ایک خیمے کا پردہ ہٹا کر ٹیکا اندر گھس گیا اور بولا:
"میرے خیال کے مطابق اس خیمے میں نو لڑکے اور لڑکیاں
سوتے ہیں، میرے خیال میں دونوں نئے شکار بھی اگر اسی خیمے
میں سو جائیں تو بہتر رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ تم دونوں اپنے اس خیمے کو پہچان لو، اسے
گن لو کہ کون سے نمبر پر ہے۔۔۔۔ اس کے بعد ہم تمہیں وہاں لے
چلیں گے، جہاں دوسرے گئے ہیں، ہمارا ایک اصول یہ بھی ہے
کہ کسی کو بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے، سب کو مصروف رکھتے
ہیں، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو اپنے ماں
باپ یاد نہیں آتے۔"

محمود اور شمائلہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ خیمے کو ایک نظر دیکھتے
ہی وہ جان گئے تھے کہ اس میں گیارہ تو کیا نو لڑکوں لڑکیوں کے
لیے بھی جگہ بالکل ناکافی ہے، زیادہ سے زیادہ اس میں چار لڑکے

آسانی سے رات بسر کر سکتے تھے، لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے اور کر
بھی کیا سکتے تھے۔۔۔۔ غارے کے اشارے پر خیمے سے باہر نکل
آئے۔ اب وہ اس سمت ہی چلنے لگے جس طرف لڑکوں اور لڑکیوں
کی قطار گئی تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے،
جہاں بڑے بڑے پتھروں پر سینکڑوں لڑکے اور لڑکیاں ہتھوڑے
برسا رہے تھے۔ ٹھکا ٹھک کی بے شمار آوازیں گونج رہی تھیں، اور
ٹمپن کوڑوں والے ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ بھی یہاں
چند آدمی نظر آئے جو اونچی جگہوں پر کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں
میں سنگینیں تھیں، جونہی کوئی لڑکا یا لڑکی سست پڑتا نظر آتا،
کوڑا اس کی کمر کی خبر لیتا اور اس کی چیخ پہاڑیوں میں گونج کر
رہ جاتی۔ انھوں نے نزدیک ترین لڑکوں اور لڑکیوں کے چہروں کو
دیکھا، ان کے رنگ اس حد تک زرد تھے جیسے خون کا ایک قطرہ
بھی نہ بچا ہو، آنکھوں میں اداسی، حسرت اور یاس کا ایک
ایسا عالم تھا کہ۔۔۔۔ انھیں اپنے دل پھٹتے محسوس ہوتے۔ ان
چہروں پر نیل پڑے ہوئے تھے، مارنے والے بے رحم یہ نہیں
دیکھتے تھے کہ کوڑا کہاں لگ رہا ہے۔ ان کے ہتھوڑوں والے ہاتھ
مشینی انداز میں تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ ایک طرف ایک ٹرک اور
لگا ہوا تھا۔ اس پر تیار شدہ پتھر ٹوکریوں میں بھر بھر کر لادے جا
رہے تھے، ٹوکریوں میں بھرنے والے بھی لڑکے اور لڑکیاں تھے

اور ٹرک پر ٹوکریاں اٹھانے والے بھی وہی، گویا سارا کا سارا کام وہی کرتے تھے.... صرف ڈرائیور کو ٹرک وہاں سے لے جانا پڑتا تھا یا لانا پڑتا تھا۔ اچانک غارے نے بلند آواز میں کہا:

"ٹھہرو!"

یک لخت سب کے ہاتھ رک گئے۔ پوری وادی پر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ سب کے سب غارے اور ان کی طرف دیکھنے لگے:

"تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ" غارے نے گرج دار آواز میں کہنا شروع کیا: "آج تم میں دو نئے مہمانوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس خوشی میں آدھے منٹ تک تالیاں بجائی جائیں۔"

مشینی انداز میں سب کے ہاتھ تالیاں بجانے لگے، تالیوں کی اس آواز سے کوئی خوشی ظاہر نہیں ہو رہی تھی، انہیں یوں لگا جیسے تالیاں رو رہی ہوں، عین اسی وقت ایک کار تیزی سے چلتی ہوئی ان کے قریب آ رکی۔ انہوں نے دیکھا، کار سے اترنے والا وہی موٹے جسم والا استاد تھا۔

○

انہوں نے دیکھا، ٹرک پر پتھر لدے ہوئے تھے جو سڑکیں اور عمارات بنانے کے کام آتے ہیں۔ ٹرک کو دیکھ کر وہ دبک

گئے تھے، جب ٹرک دور نکل گیا تو اس طرف بڑھے جس طرف سے ٹرک آیا تھا۔

"تو یہاں پہاڑیوں سے پتھر توڑے جاتے ہیں.... اس کے لیے ان لوگوں کو بارود سے کام لینا پڑتا ہو گا اور پھر بڑے بڑے پتھروں کو توڑنا پڑتا ہو گا۔"

"لیکن ابا جان! اگر یہاں کام ہوتا ہے تو محمود اور شہزاد کے یہاں ہونے کا امکان تو ختم ہو جاتا ہے اور اس کا مطلب ہے، ان لوگوں کو شہر میں ہی کہیں رکھا گیا، لہٰذا اس طرف آگے بڑھنے کی بجائے واپس چلنا چاہیے۔"

"ابھی ذرا دیکھ تو لیں کہ یہ لوگ یہاں کس طرح کام کرتے یا کراتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور آگے بڑھنے لگے۔ اچانک ایک کار پہاڑی راستے سے آتی نظر آئی، پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے کار ان کے پاس سے گزر کر اس طرف چلی گئی جس طرف سے ٹرک آیا تھا۔ انسپکٹر جمشید اور تیزی سے قدم اٹھانے لگے۔ فاروق اور فرزانہ کے لیے ان کا ساتھ دینا مشکل ثابت ہو رہا تھا، لیکن جیسے تیسے وہ آگے بڑھ ہی رہے تھے۔

"فاروق! میرا دل کہہ رہا ہے، محمود اور اس لڑکی کو اسی جگہ لایا گیا ہے۔" اچانک انسپکٹر جمشید نے عجیب سی آواز میں کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر وہ دونوں یقیناً یہیں ہیں،" [illegible] بولی

یہ ہے کہ اغوا کرنے والے انہیں یہاں کیوں لائے ہیں۔" فاروق
نے کہا۔

"سنو! اگر اغوا کرنے والوں کا تعلق ایسے لوگوں سے ہو جو
رقم کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ اغوا کرنے کے چند گھنٹے بعد
ہی بچے کے ماں باپ کو فون کر دیتے ہیں، لیکن محمود اور شاکرہ
کو اغوا ہوئے پوری ایک رات گزر گئی، لیکن نہ سر ہارون
کو کوئی فون موصول ہوا، نہ ہمیں۔"

"تو پھر! اس سے آپ کیا اندازہ لگا رہے ہیں؟"

"میں اپنا اندازہ ابھی ظاہر کر بتاؤں گا۔" انہوں نے فکر مند
لہجے میں کہا اور فاروق اور فرزانہ نے انہیں حیران ہو کر دیکھا، کیونکہ
ابھی تک انہوں نے انہیں فکر مند نہیں دیکھا تھا۔

"ابا جان! آپ یکایک فکر مند کیوں ہو گئے؟" فرزانہ بولی۔

"اس کی وجہ ہے فرزانہ..... کچھ دیر ٹھہرو، میں غور کر
رہا ہوں۔"

وہ آگے بڑھتے رہے اور پھر ان کے اٹھتے قدم
رک گئے۔ ان کے سامنے خاردار تاروں کی ایک اونچی سی دیوار
تھی اور اس دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ دروازے پر چار
آدمی پہرہ دے رہے تھے، ابھی تک پہرے داروں کی نظریں
ان پر نہیں پڑی تھیں..... انسپکٹر جمشید نے چند لمحے کے لیے

سوچا اور پھر انہیں پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک
چٹان کی اوٹ میں ہو گئے۔

"آخر وہی بات نکلی جس سے میں ڈر رہا تھا۔"

"جی! کیا مطلب؟"

"یہ ایک کیمپ ہے۔ خرکاروں کا کیمپ۔"

"اوہ!" دونوں کے منہ سے خوف زدہ لہجے میں نکلا۔

"ہاں! اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ محمود اور شاکرہ خرکاروں
کے ہتھے چڑھ گئے ہیں ورنہ محمود قابو میں آنے والا نہیں۔"

"اف خدا۔ اب کیا ہو گا، ابا جان! آپ کیا کریں گے؟"

"میں آگے چل کر حالات کا جائزہ لوں گا، تم دونوں یہیں ٹھہرو
گے، اگر میں آدھ گھنٹے تک واپس نہ آؤں تو تم فوراً یہاں سے
لوٹ جاؤ گے، بذریعہ گاڑی اپنے شہر پہنچو گے اور وہاں جاتے
ہی آئی جی صاحب کو سارے حالات کہہ سنانا، انہیں یہ بھی
بتا دینا کہ سر ہارون کی بیٹی بھی خرکاروں کے قبضے میں ہے، وہ
سر ہارون کو بھی فون کر دیں گے..... اور اس طرح بڑے پیمانے
پر ان کی گرفتاری کے لیے قدم اٹھایا جائے گا، لیکن..... لیکن۔"
انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔ فکر اور پریشانی سے ان کی پیشانی
پر بل پڑ گئے۔

"آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے آئی جی صاحب [illegible]

محمود کے لیے بڑے پیمانے پر گرفتاری کے لیے قدم نہیں ..... اٹھائیں گے" فاروق بولا۔

"یہ بات نہیں، سر ہارون کی بیٹی کے لیے اس وقت پورے شہر کی پولیس بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ سر ہارون نے انعام کا اعلان بھی کر دیا ہو گا، اس لیے ان کا نام لینے کی صورت میں حالات کچھ اور ہی ہوں گے"

"بہت بہتر! ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے"

"اچھا تو پھر خدا حافظ، ہو سکتا ہے، میں چند منٹ بعد ہی واپس آ جاؤں"

"خدا حافظ ابا جان!" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

اور وہ تاروں کی باڑھ کی طرف بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ دروازے کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ اب چوکیداروں نے انہیں دیکھا۔ ان کے چہروں پر حیرت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ عین اسی وقت اندر سے ایک آدمی دروازے کی طرف بڑھتا نظر آیا، پھر اس سے پہلے کہ انسپکٹر جمشید دروازے تک پہنچتے، وہ ان کے قریب پہنچ گیا، انہوں نے دیکھا، وہ ان میں ایک کے کان کے قریب منہ لے گیا اور کچھ کہنے لگا، دوسرے چوکیدار بھی اس کے نزدیک ہو گئے۔

ایسے میں بھی ان کی نظریں انسپکٹر جمشید ہی کی طرف لگی رہیں، یہاں تک کہ وہ دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اب سرگوشی کرنے والا سیدھا ہو گیا اور ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

انسپکٹر جمشید کو اس وقت ایک عجیب سا احساس ہوا۔

چلو باہر نکلو

"استاد! تم آ گئے؟" خارا اور ٹھیکا اس کی طرف مڑے۔

"ہاں! آ گیا، باس کہاں ہے؟"

"اپنے خیمے میں، ٹامی کے ساتھ۔"

"بہت خوب! ان کے لیے میرے پاس ایک انتہائی اہم اطلاع ہے، میں وہ اطلاع دے کر ابھی تم لوگوں کے پاس آتا ہوں۔"

اس نے کہا اور مڑنے لگا۔

"کیوں استاد، خیر تو ہے، ان لوگوں کی تلاش میں کچھ لوگ مکان تک تو نہیں پہنچ گئے تھے؟" ٹھیکا نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! پہنچ گئے تھے۔" استاد نے گول مول جواب دیا۔

"پہنچ گئے تھے تو کیا ہوا، تم نے انہیں چکما دے کر ٹرخا دیا ہوگا۔"

خارا نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے، میں نے انہیں کوئی چکر دینے کی کوشش نہیں کی اور میرا خیال ہے، میں نے یہ اچھا ہی کیا۔" استاد نے عجیب

بات کہی۔

"کیا مطلب؟"

"پہلے میں باس سے بات کر آؤں، پھر تمہیں آ کر بتاتا ہوں... ہو سکتا ہے، باس کوئی فوری حکم دے، اس لیے تم سب ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔"

"آج تو تم عجیب عجیب باتیں کر رہے ہو۔"

"ہاں! خود مجھے بھی یہ باتیں عجیب لگ رہی ہیں، لیکن میں کیا کروں۔" یہ کہہ کر استاد مڑا اور پیدل ہی اس سمت میں چلا گیا، جدھر سے وہ تھوڑی دیر پہلے آئے تھے۔

باس کے خیمے کے دروازے پہ پہنچ کر اس نے باادب لہجے میں کہا:

"باس! استاد اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔"

"آ جاؤ استاد!" اندر سے وہی چھینی چھینی آواز سنائی دی۔ استاد نے پردہ اٹھایا اور اندر چلا گیا۔ یہاں باس کے ساتھ ٹامی بھی تھا۔

"کہو استاد، سب خیریت تو رہی؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا باس!" استاد نے فوراً کہا۔

"کیا مطلب؟" باس زور سے چونکا۔

"مطلب یہ باس کہ ایک ایسا شخص ہمارے پیچھے لگ گیا ہے، جو انتہائی خطرناک ہے۔ میں حیران ہوں کہ وہ پیچھے کیوں کر لگ گیا ہے۔"

"تمہاری باتیں میرے پلے نہیں پڑیں"

"میں مکان کو باہر سے تالا لگا کر درخت پہ چڑھا نگرانی کر رہا تھا کہ وہ شخص ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ساتھ وہاں آگیا۔ اس نے اپنی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور اس کے ذریعے تالا کھول لیا۔ اس کے بعد وہ اندر چلے گئے، پھر باہر آکر کار کے ٹائروں اور قدموں کے نشانات دیکھنے لگے۔ پھر سڑک کی طرف چلے گئے، ایک بار پھر وہ پلٹ کر آئے اور نشانات کو دیکھا اور سڑک کی طرف چلے گئے۔ میں اس دوران درخت سے نیچے اتر آیا تھا، لیکن انہیں پھر آتے دیکھ کر دبک گیا تھا، اب میں ان کے پیچھے چلتا ہوا سڑک پر آیا تو وہ ایک جیپ میں بیٹھ کر علی آباد کی طرف روانہ ہو چکے تھے..... گویا وہ ہمارے راستے پر لگ چکے ہیں" یہاں تک کہہ کر استاد خاموش ہو گیا۔

"اتنی بھی چوڑی تفصیل تو تم نے بتا دی اور یہ اب تک نہیں بتایا کہ وہ آدمی کون ہے جس سے تم خطرہ محسوس کر رہے ہو"

"وہ..... وہ انسپکٹر جمشید تھا"

"اوہو اچھا! اس کا بہت نام سنا ہے، کیا تم اس کے بارے میں کچھ اور بھی جانتے ہو" باس نے استاد سے پوچھا۔

"جی ہاں! وہ جرم کی بو بہت دور سے سونگھ لیتا ہے، وہ چیتے کی طرح پھرتیلا ہے، بڑے بڑے مجرم اس سے بچ نہیں سکے، وہ

جرائم کی دنیا کا ہوّا ہے"

"بس یا اور کچھ"

"وہ اور بھی بہت کچھ ہے، میں شاید بتا بھی نہیں سکتا"

"اور وہ صرف ایک انسپکٹر ہے"

"جی ہاں! ہے تو وہ صرف ایک انسپکٹر، لیکن اس کے اختیارات بے پناہ ہیں"

"تم فکر نہ کرو، میں اسے بے بس کر دوں گا، اس کے سارے اختیارات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اگر وہ اس طرف آیا تو وہ منہ کی کھائے گا کہ ساری زندگی یاد کرے گا"

"اور مجھے ڈر ہے کہ وہ آچکا ہو گا، کیونکہ وہ آرام کرنے کا عادی نہیں" استاد نے کہا۔

"تو گیٹ پہ یہ ہدایات بھیج دو کہ کوئی میری اجازت کے بغیر اندر داخل نہ ہونے پائے، چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ ہم نے ان پہاڑیوں کا مستقل طور پہ ٹھیکا لے رکھا ہے اور اس علاقے میں کوئی ہماری مرضی کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا" باس نے کہا۔

"بہت بہتر! میں ابھی ہدایات بھیج دیتا ہوں" استاد نے کہا اور خیمے سے نکل کر باہر کھڑے ایک چوکیدار سے کہہ دیا، وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ پھر اندر داخل ہوا۔

"معاف کیجئے گا باس! میں آپ کی خدمت میں ایک مشورہ

پیش کرنا چاہتا ہوں۔" نامی نے اس گفتگو میں پہلی بار دخل دیا۔
"ضرور نامی! میں ہمیشہ تمہارے مشوروں کو غور سے سنتا ہوں۔"
"مشورہ یہ ہے باس کہ انسپکٹر جمشید سے کھلم کھلا مخالفت مول لینے کی بجائے اگر اسے چکر میں ڈال کر یہاں سے رخصت کر دیا جائے تو یہ بہتر رہے گا..... اس طرح وہ کوئی شک نہیں کر سکے گا۔"
"تمہارا مطلب ہے، تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو چھپا دیا جائے اور اس کے بعد انسپکٹر جمشید کو اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔" باس نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔
"جی ہاں! میرا مشورہ یہی ہے، لیکن آپ مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے، ہمیں تمہارا مشورہ پسند آیا، فوراً اس کا بندوبست کیا جائے۔" باس نے کہا۔
"بہت بہتر جناب!" نامی نے کہا پھر استاد کی طرف مڑا۔
"آؤ استاد! جلدی کرو۔"
دونوں خیمے سے نکل کر اس طرف چل پڑے جہاں پتھر توڑے جا رہے تھے۔

○

ایک کوڑا برسانے والے نے ٹیکا کی ہدایت پر انہیں بھی

ہتھوڑے دے دیے اور انہیں پتھروں پر بٹھا دیا گیا۔ دوسروں کو چند لمحوں تک دیکھنے کے بعد انہوں نے ہتھوڑے چلانے شروع کر دیے، محمود کا ہاتھ تو فوراً چل پڑا، لیکن شائلہ نے بھلا کب ایسے کام کیے تھے۔ دو منٹ میں ہی وہ ہانپنے لگی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسی وقت کوڑا اس کے سر پر لہرایا، شائلہ کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی۔ کوڑے نے اس کی کمر اور چہرے کو چاٹ لیا تھا۔ فوراً ہی اس کے گال پر کوڑے کا نشان ابھر آیا، ہتھوڑا پھینک کر اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔
"ہتھوڑا مت پھینکو لڑکی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی کوڑا ایک بار پھر لہرایا۔ اس کی چیخ پھر نکلی اور ہاتھ فوراً چہرے سے ہٹ کر ہتھوڑے کی طرف بڑھے۔ اس دوران دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔ کوڑے لہراتے رہے، چیخیں گونجتی رہیں اور ہتھوڑے پتھروں پر برستے رہے۔ ان کے برسنے کی آوازیں دماغوں میں گونج پیدا کرتی رہیں۔ محمود مسلسل ہتھوڑا چلا رہا تھا۔ اب شائلہ بھی مسلسل ہتھوڑا چلانے لگی تھی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے..... اور یہ منظر دیکھ کر محمود کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہاں بیسیوں لڑکے اور لڑکیاں دس سال سے بھی کم عمر کے تھے..... [illegible] عمر کے کم تھے۔ ایک لڑکا تو چھ سال کی [illegible]

اس کے چہرے پر نہ رنج کے آثار تھے نہ خوشی کے.... بس بس گھبرایا سا تھا۔ اس کا ننھا سا ذہن بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ محمود نے محسوس کیا، اگر اسے چند دن یہاں رہنا پڑ گیا تو وہ ضرور پاگل ہو جائے گا۔

عین اس وقت اس نے تیز تیز قدموں کی آواز سنی، منہ اٹھا کر دیکھا تو استاد اور نامی آ رہے تھے۔ آتے ہی انھوں نے بلند آواز میں کہا:

"الاٹ.... الاٹ!"

محمود اور شائستہ کچھ نہ سمجھے، لیکن دوسرے ایک دم اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ہتھوڑے ابھی ہاتھوں میں پکڑے رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ایک کوڑے والے نے کوڑا زور سے لہرایا اور ایک طرف چلنے لگا۔ سب لڑکے لڑکیاں تیز تیز قدم اٹھاتے اس کے پیچھے چلنے لگے، چند منٹ بعد ہی وہ سب کے سب ایک چٹان کے پیچھے غائب ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی چاروں میناروں پر سے پہرے دار اتر کر اس جگہ پہنچ گئے۔ ملیکا اور خارا کے تینوں ساتھی بھی ان میں شامل ہو گئے۔ خیموں کی طرف سے بھی کوئی دس کے قریب آدمی وہاں پہنچ گئے۔ اب وہ سب ہتھوڑے سنبھال کر بیٹھ گئے اور زور شور سے پتھروں پر برسانے لگے۔ صرف نامی، استاد، ملیکا اور خارا کھڑے رہ گئے۔

انھوں نے بھی چار الگ الگ جگہوں کو منتخب کریں، گویا وہ کام کی نگرانی کرنے والے تھے۔ کوڑوں کو ایک بڑے سے پتھر کے نیچے چھپا دیا گیا۔ اس کے ارد گرد دوسرے پتھروں کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ یہ کام صرف دو منٹ میں انجام پا گیا.... یہ دیکھ کر نامی نے اطمینان کا سانس لیا اور وہ اور استاد تیز تیز قدم اٹھاتے باس کے خیمے کی طرف روانہ ہو گئے۔

"کیا تم سب تیاریاں مکمل کر چکے؟" باس نے انھیں دیکھ کر پوچھا۔

"جی باس!" نامی بولا۔

"انسپکٹر جمشید تم میں سے کسی کو پہچانتا تو نہیں؟"

"کسی زمانے میں اس کا اور میرا آمنا سامنا ہوا تھا، شاید وہ مجھے پہچان لے۔" استاد نے یاد کرنے والے انداز میں کہا۔

"تب تم بھی وہیں چلے جاؤ، اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو پھر اس طرح کرنا چاہیے کہ اسے ذرا بھی شک نہ ہو...."

استاد کے جانے کے کوئی چند منٹ بعد گیٹ والا ایک پہرے دار نظر آیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ خیمے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے کہا:

"باس! انسپکٹر جمشید آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، انھیں عزت اور احترام سے یہاں لے آؤ...."

اور ہاں، اس کے نزدیک آنے سے پہلے تم نے مشین گنیں تو چھپا لی تھیں نا؟"

"جی ہاں! یہ تو ہم ہمیشہ ہی کرتے ہیں، جونہی کوئی اجنبی جیپ نظر آتا ہے، سب سے پہلے مشین گنیں ایک طرف کر دی جاتی ہیں۔"

"بہت خوب! جاؤ، اسے لے آؤ، دیکھو! بالکل پرسکون رہنا، اسے ذرا بھی شک نہ ہو۔"

"بہت بہتر باس! آپ فکر نہ کریں۔"

پہرے دار چلا گیا۔ باس تامی کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد پہرے دار کی آواز سنائی دی۔

"اندر چلے جائیے جناب!"

باس اور تامی نے دیکھا، ایک نوجوان آدمی ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔ ان کے چہروں پر پُر اخلاق مسکراہٹیں تھیں۔

"مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں.... یہ میرے بچے ہیں۔"

"اور میں قادر بخت خان ہوں.... اس جگہ کا ٹھیکیدار، یہ میرے نائب ہیں ارشد تامی۔"

انہوں نے آپس میں ہاتھ ملائے۔

"ایک عرصے سے یہ دونوں کسی ایسی جگہ کی سیر کرنے کے خواہش مند تھے جہاں پہاڑیوں کو توڑ کر پتھر حاصل کیے جاتے ہوں.... ہم

یہاں کی سیر کرنے آئے ہیں، امید ہے، آپ اجازت دیں گے۔"

"اوہ میں سمجھا شاید کسی تفتیش کے سلسلے میں آئے ہیں، شوق سے سیر کیجیے جناب، مسٹر تامی آپ انہیں خوب سیر کرا دیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ!" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے، ان کے ساتھ ہی فاروق اور فرزانہ بھی اٹھے۔

"ارے ارے، سیر سے پہلے کچھ پی تو لیجیے۔"

"اس کی ضرورت نہیں، ہم ابھی ابھی ناشتا کر کے آئے ہیں۔"

"بہتر، مسٹر تامی.... انہیں خوب اچھی طرح سیر کرا لائیے۔"

"جی بہت بہتر۔" تامی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ انہیں لے کر خیمے سے نکلا اور سیدھا اس جگہ لایا جہاں پتھر توڑے جا رہے تھے۔ وہ انہیں بتاتا رہا کہ کس طرح بارودی سرنگیں بچھائی جاتی ہیں اور پھر بارود کو آگ دکھا دی جاتی ہے۔ اس طرح بڑے بڑے پتھر ٹوٹ کر نیچے آ گرتے ہیں۔ اس کے بعد مزدور انہیں اٹھاتے اور ٹرکوں پر لادتے ہیں۔ یہ پتھر پھر سڑکیں اور عمارات بنانے کے کام آتے ہیں۔

وہ اس کے ساتھ گھومتے پھرے، انہوں نے کام کرنے والوں کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ ایک ایک چہرے کو پڑھا، لیکن کسی چہرے پر خوف کے آثار نظر نہ آئے، اگر کوئی لڑکا یا لڑکی تو وہاں کوئی تھا ہی نہیں، جس سے وہ کچھ پوچھتے۔ آدھ گھنٹے کی سیر

گئے بعد بھی انہیں کوئی مشکوک بات نظر نہ آئی۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے واپسی کی ٹھانی۔ ٹامی انہیں لے کر پھر باس کے کمرے میں آیا۔

"بھئی ٹامی! اتنی جلدی انہیں لے آئے، کیا سب کچھ دکھا دیا؟"

"جی ہاں! انہوں نے تمام علاقہ دیکھ ڈالا ہے۔"

"بہت خوب! تو پھر ان کے لیے چائے کا بندوبست کرو۔"

"نہیں جناب! اب ہم چلیں گے، آپ کا بہت بہت شکریہ!"

"بہت اچھا! ٹامی انہیں دروازے تک رخصت کر آؤ۔"

وہ ٹامی کے ساتھ چلتے گیٹ پر پہنچے اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر باہر نکل آئے۔ ٹامی واپس مڑ گیا اور باس کے خیمے میں پہنچا۔

"کیوں باس کیسی رہی؟" اس نے کہا۔

"بہت اچھی، تمہارا مشورہ واقعی بہت خوب تھا۔ بلاوجہ اس سے خطرہ مول لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اور ہاں ابھی کچھ دیر سب لوگ اسی طرح کام کرتے رہیں گے، جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ اب ان کے لوٹ کر آنے کا کوئی امکان نہیں رہا تو ان کو نکال لایا جائے گا۔"

"بہت بہتر باس۔"

"اور ہاں! تھوڑی دیر بعد اس لڑکے اور لڑکی کو بھی یہاں واپس لانا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کا انسپکٹر جمشید سے کس سے تعلق ہے، آخر یہ شخص جنگل والے مکان تک کس طرح

پہنچ گیا اور اس غار سے اور ٹھیکا سے کہہ دو کہ ابھی چند دن تک کوئی واردات نہ کرے۔"

"بالکل ٹھیک باس! میں ابھی انہیں یہ ہدایات دیتا ہوں اور ان دونوں کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔"

○

جس جگہ ان سب کو لایا گیا تھا، وہ ایک بہت بڑے چوڑے غار کی مانند تھی۔ سب لڑکے اور لڑکیاں اس میں نہایت آسانی سے سما گئے۔ محمود اور شاکر بہت حیران تھے۔ جب سب غار میں آ کر بیٹھ گئے تو محمود نے اپنے نزدیک ترین لڑکے سے سرگوشی میں کہا:

"بھئی یہ کیا چکر ہے، یہ ہمیں اس طرح اچانک یہاں کیوں لاتے ہیں؟"

"جب بھی کوئی سرکاری افسر ادھر آ نکلتا ہے تو یہی لفظ بلند آواز میں دہرایا جاتا ہے اور ہم سب کو اس غار میں بند کر دیا جاتا ہے، تاکہ افسر معائنہ کر کے چلا جائے اور اسے یہ شک بھی نہ ہو کہ یہ کیمپ دراصل خرکاروں کا کیمپ ہے۔"

"اوہ! تو کیا اس وقت کوئی سرکاری افسر یہاں آیا ہے؟"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔" اس لڑکے نے کہا۔

"تو ہم سب شور مچا کر اس افسر کو خبردار کیوں نہ کر دیں؟"

محمود نے گویا ترکیب اسے بتائی۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔۔۔ اس غار کے منہ پر ہمارے اندر آنے کے فوراً بعد گھاس اور پھوس ڈال دیا گیا ہے، ہماری آوازیں اس جگہ تک نہیں پہنچ سکیں گی جہاں آفیسر اس وقت چکر لگا رہا ہوگا اور پھر اس جگہ پتھر توڑے جانے کی آوازیں اس قدر تیز ہوں گی کہ آواز وہاں تک بالکل بھی نہیں پہنچ سکتی۔"

"لیکن پتھر توڑنے والے تو یہاں موجود ہیں" محمود بولا۔

"اب وہاں سب پہرے دار پتھر توڑ رہے ہوں گے۔ ایک بار ہم نے شور مچا دیا تھا، لیکن کچھ بھی نہ بنا اور بعد میں ہم پر اتنے کوڑے برسائے گئے، اتنے کوڑے برسائے گئے کہ ہمارے بدن لہولہان ہو گئے اور زخموں پر لگانے کے لیے کوئی مرہم بھی نہ دیا گیا۔ زخم یا تو سڑ گئے یا دھوپ میں خشک ہو گئے، جن کے زخم سڑے ان میں سے کئی مر گئے اور جو نہ مرے وہ سسکتے رہے، تڑپتے رہے، یہاں تک کہ زخم خشک ہو گئے۔ اس دن کے بعد کسی نے پھر شور مچانے کی جرأت نہیں کی۔"

"تمہیں یہاں آئے کتنا عرصہ ہو گیا" محمود نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔۔۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے، خود کو اس کیمپ میں پایا ہے۔۔۔۔ میں نہیں جانتا، میرا کیا نام ہے، میرے ماں باپ کون ہیں۔۔۔۔ وہ کہاں رہتے ہیں" یہ کہتے کہتے وہ رونے لگا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش کی طرح بہنے لگے۔ محمود کا دل پھٹنے لگا۔ اس کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ شمائلہ بھی رونے لگی۔۔۔۔ لیکن رونے کی آواز بلند نہیں ہونے پائی، ورنہ کوڑے ان کے سروں پہ چکرانے لگتے۔ ایسے میں محمود سوچنے لگا، کیا میں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ کیا ہم سب یہاں سے واپس جا سکیں گے۔۔۔۔۔۔ کیا ابا جان ان لوگوں کی راہ پر لگ جائیں گے، بارہا ایسا ہو چکا تھا، مجرموں نے انہیں اغوا کر لیا تھا، لیکن بعد میں انسپکٹر جمشید ان کی راہ پر لگ گئے تھے اور ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی!

"یا اللہ! ابا جان کو اس طرف بھیج دے۔۔۔۔ کیونکہ اب صرف وہی ان سب بچوں کے نجات دہندہ ثابت ہو سکتے ہیں۔"

دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ اگر وہ اس طرف نہ آسکے تو کیا ہوگا۔ کیا وہ سب یہاں زندگی بھر ایڑیاں رگڑتے رہیں گے، سسکتے رہیں گے۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد غار کے منہ سے ایک آواز ابھری:

"چلو باہر نکلو۔"

جنگل میں

"کیا خیال ہے ابا جان! یہ کیمپ تو خرکاروں کا کیمپ معلوم نہیں ہوتا۔" فرزانہ نے گیٹ سے کافی دور آنے کے بعد کہا۔

"ہاں! یہ تو خیر ٹھیک ہے، لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، آخر ہمارے گیٹ کے پاس پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے ایک آدمی نے آکر گیٹ پر کھڑے چوکیداروں سے کان میں کیا کہا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ بات واقعی عجیب ہے، لیکن ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ وہ کیا بات تھی جو چوکیداروں کے کان میں کہی گئی۔" فاروق نے کہا۔

"خیر! دیکھا جائے گا، ہم ہوٹل جا کر اپنے شہر کے حالات معلوم کریں گے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک محمود واپس گھر پہنچ چکا ہو یا پھر اغوا کرنے والوں کے فون موصول ہو چکے ہوں۔"

"تب پھر اس مکان تک محمود کے پہنچنے کا کیا مطلب تھا

اور کار کے ٹائروں کے نشانات اس شہر کی طرف کیوں اشارہ
کر رہے تھے؟"

"ہو سکتا ہے، انہیں اغوا کر کے اسی شہر میں لایا گیا ہو اور
عارضی طور پر اس مکان میں رکھا گیا ہو..... لیکن اس شہر میں
لانے کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ وہ اس جگہ کے علاوہ
کہیں اور ہو ہی نہیں سکتے۔"

"تو پھر وہ ضرور کسی اور جگہ ہیں، لیکن ہیں اس شہر میں۔"
فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

اب وہ اپنی جیپ تک پہنچ گئے تھے..... کچھ دیر بعد
وہ ہوٹل میں موجود تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے کاؤنٹر
کلرک سے پوچھا کہ ان کا کوئی فون تو نہیں آیا۔ اس نے
انکار میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ پہلے
انہوں نے گھر فون کیا۔ بیگم جمشید نے انہیں بتایا کہ نہ تو
محمود واپس آیا ہے اور نہ انہیں کوئی فون ملا ہے۔ اب انہوں
نے اکرام کو فون کیا۔ اکرام کی آواز بہت بوکھلائی ہوئی
تھی۔ اس نے کہا:

"سر! خدا کے لیے آپ جہاں بھی ہیں، یہاں آ جائیے،
آفیسر بار بار آپ کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔

یہاں سارے شہر کی پولیس کا ناک میں دم آ چکا ہے، ابھی تک
سر ہارون کی بیٹی کا بھی کوئی پتا نہیں چلا۔"

"میرے بارے میں تم افسرانِ بالا کو بتا دیجئے کہ میں علی آباد
میں موجود ہوں اور اغوا کرنے والوں کے تعاقب میں ہوں، بلکہ
میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ شاید ہارون اور محمود کو ایک ہی
گروہ نے اغوا کیا ہے، کیونکہ کل کے روز کسی اور کے اغوا
ہونے کی کوئی خبر ابھی تک نہیں ملی۔ صرف یہ دو اغوا ہوئے ہیں
اور جس مکان میں ان دونوں کو عارضی طور پر رکھا گیا تھا، وہاں محمود
اور ایک لڑکی کے جوتوں کے نشان موجود ہیں..... اگر یہ لوگ چاہیں
تو اس مکان کو دیکھ سکتے ہیں۔"

"تو کیا میں یہ سب باتیں آئی جی صاحب کو بتا دوں؟"

"ہاں! اور یہ بھی بتا دینا کہ میں ابھی واپس نہیں آ سکتا جب
تک محمود کا کوئی پتا نہیں چل جاتا، میں کس طرح واپس آ سکتا ہوں جب
کہ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ انہیں اسی شہر میں اغوا کر کے لایا گیا ہے۔"

"بہت خوب! تو پھر یہ بتا دیں کہ وہ مکان کہاں ہے؟"

"ہاں ضرور، نوٹ کر لو۔" یہ کہہ کر انہوں نے مکان کا محل وقوع
بتانے کے بعد سلسلہ قطع کر دیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ پھر شہر کا جائزہ لیتے پھرتے رہے۔ اسی طرح
رات ہو گئی، لیکن انہیں کسی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آخر انسپکٹر

جمشید نے تنگ آ کر کہا:

"کچھ نہ کرنے سے کرنا بہتر ہے، اگرچہ مجھے اس ٹھیکیدار پر کوئی شک نہیں، لیکن کیوں نہ ہم آج رات ان کی بے خبری میں اس علاقے کا جائزہ لیں۔"

"خود میرا دل بھی یہی چاہ رہا ہے، بلکہ مجھے تو ایک بات بہت کھٹک رہی ہے۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی بات کھٹکی تو، ورنہ میں تو مایوس ہی ہو چلا تھا۔" فاروق بولا۔

"جلدی بتاؤ فرزانہ۔"

"اب مجھے یاد آیا، مجھے ایک نہیں دو باتیں کھٹک رہی ہیں۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"یا اللہ رحم ..... کہیں دو کا تین نہ ہو جائیں۔" فاروق بولا۔

"پہلی بات تو یہ کہ اس پورے ایریے کے گرد خار دار تاروں کی باڑھ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسی باڑھ تو وہاں لگائی جاتی ہے، جہاں کچھ لوگوں کے فرار ہونے کا خطرہ ہو، یا کسی قیمتی چیز کی حفاظت کا خیال ہے، اب لوگ وہاں سے چھڑ تو جانے سے رہے، دوسری بات یہ کہ ہمیں وہاں مشکل سے تیس کے قریب آدمی نظر آئے ہوں گے۔ اتنے آدمیوں کے لیے اتنے بہت سے خیموں کی کیا ضرورت ہے، ان کے لیے تو

دس خیمے بھی کافی ہیں جب کہ خیموں کی قطار بہت لمبی تھی، شاید تیس کے قریب خیمے ہوں گے۔ کیا ان میں سے ہر مزدور الگ الگ خیمے میں سوتا ہے۔"

"دونوں باتیں بہت پتے کی ہیں اور ان کی بنیاد پر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ رات کے وقت اس جگہ کا معائنہ کیا جائے۔"

"سوال یہ ہے کہ ہم اندر کیسے داخل ہوں گے۔" فاروق بولا۔

"یہ وہاں جا کر دیکھیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو پھر چلیے۔" فرزانہ نے بے قرار ہو کر کہا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے، کچھ دیر تو دم لے لو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تمہیں دم لینے کی سوجھی ہے، ادھر محمود پر نہ جانے کیا گزر رہی ہو گی۔" فرزانہ نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"بھئی میرا مطلب تھا، رات ذرا زیادہ ہو لے تاکہ کسی کے دخل دینے کا خطرہ نہ رہے۔"

"فاروق کا خیال ٹھیک ہے، ہم رات کو گیارہ بجے چلیں گے، اتنی دیر تک تم سونا چاہو تو سو سکتے ہو، تاکہ مہم کے دوران تمہیں نیند نہ آئے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نیند تو خیر ابھی کیا آئے گی۔ محمود ہم سے جدا ہے اور ہم سو جائیں، یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔" فاروق بولا۔

"لیکن ابا جان! کتوں کی موجودگی میں ہم اندر کیسے داخل ہو سکیں گے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اندر کتے کھلے پھر رہے ہوں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اس کے باوجود ہم ایک دن ضائع نہیں کر سکتے، یہ محمود کا معاملہ ہے، سر ہارون کی بیٹی کا معاملہ ہے..... نہ جانے وہ کس حال میں ہوں اور دشمنوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو۔"

"تب پھر آپ کیا کریں گے، اندر داخل ہونے کی کونسی صورت ہے۔"

"یہ کہ میں واپس ہوٹل جاؤں، وہاں کے ڈیپ فریزر سے گوشت کے ٹکڑے چراؤں اور ان پر بے ہوش کر دینے والی بے ذائقہ دوا چھڑک دوں..... پھر ان ٹکڑوں کو یہاں لے آؤں، تم اس دوران یہاں رہو گے۔"

"ترکیب تو اچھی ہے، لیکن اس طرح آپ گوشت کی چوری کا جرم کر بیٹھیں گے۔"

"یہ چوری ایک نیک مقصد کے لیے کی جائے گی اور پھر بعد میں ان کے پیسے ادا کر دیے جائیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"تو پھر بسم اللہ کیجیے۔" فرزانہ بولی۔

"ابا جان!" فاروق نے اچانک انتہائی پرجوش لہجے میں کہا۔ آواز ہی پہنچی تھی۔

"خیر! جاگتے رہو۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

ٹھیک گیارہ بجے وہ ہوٹل سے نکلے اور جیپ میں بیٹھ کر ایک بار پھر پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے، لیکن جونہی وہ جیپ سے اتر کر پیدل چلتے ہوئے باڑھ کے قریب پہنچے، ایک ساتھ کئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ انسپکٹر جمشید کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بے چارگی کے عالم میں کہا:

"بھئی! ان لوگوں نے تو کتے بھی پال رکھے ہیں، اب ہم کیا کریں؟"

"یہ آپ بتائیے....." فاروق نے گھبرا کر کہا۔ کتوں سے اس کا دم نکلتا تھا۔

"ایک ترکیب تو یہ ہے کہ کتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے، لیکن اس طرح اندر موجود چوکیدار ہوشیار ہو جائیں گے اور شاید کتے ہمارے پیچھے چھوڑ دیے جائیں۔ اس وقت تو وہ بندھے ہوئے ہوں گے....." انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور دوسری ترکیب کیا ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"یہ تم بتاؤ، آخر تم بھی تو ہمارے ساتھ ہو۔" فاروق بولا۔

"دوسری ترکیب یہ ہے کہ ہم آج واپس چلے جاتے ہیں اور کل کتوں کا کوئی بندوبست کر کے یہاں آ جائیں گے۔" فرزانہ بولی۔

"ترکیب اچھی ہے، لیکن اس طرح ایک دن ضائع ہو جائے گا۔" انسپکٹر جمشید نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ارے! تمہیں کیا ہوا؟" وہ چونکے۔
"ہم.... ہم نہایت آسانی سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اندر فاروق موجود ہے یا نہیں۔"
"اوہ!" انسپکٹر جمشید بھی زور سے چونکے، یہ خیال واقعی انہیں نہیں آیا تھا، فرزانہ سے بھی چوک ہوئی تھی، بالکل سامنے کی بات تھی۔

○

سورج غروب ہونے تک پتھر توڑتے توڑتے ان کے ہاتھ شل ہو گئے۔ ہتھیلی پر آبلے پڑ گئے۔ سب سے برا حال شائلہ کا تھا۔ محمود تو پھر سخت کاموں کا عادی تھا، لیکن شائلہ کے لیے یہ دن پہاڑ تھا۔ اس دوران ان میں سے نہ جانے کتنوں کو کوڑوں سے بری طرح پیٹا گیا..... شائلہ کی شامت کئی مرتبہ آئی۔ محمود چاہتا تھا، اس کے حصے کے پتھر بھی وہ توڑ دے، لیکن بھلا کیمپ کے نگران ظالم درندے کب یہ منظور کر سکتے تھے، اور پھر صبح سے شام تک تو ظاہر ہے، محمود اپنے ہی حصے کے پتھر توڑ سکتا تھا، آخر خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا اور انہیں خیموں کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا گیا، اپنے اپنے ہتھوڑے ہاتھوں میں لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمود نے شائلہ کو سہارا دے کر اٹھایا تو خارے نے آگے بڑھ کر

ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر اس زور سے رسید کیا کہ آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ مجبوراً اس نے شائلہ کو چھوڑ دیا، وہ اس کے ساتھ لڑکھڑانے لگی، گھسٹنے لگی، پھر اچانک دھڑام سے گری اور بے ہوش ہو گئی، لیکن اس کے بے ہوش ہونے پر کوئی بھی نہ رکا، البتہ محمود کے قدم آگے نہ بڑھ سکے:
"تم کیوں رک گئے ہو؟" ایک کوڑے والے نے اس کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔
"دیکھیے نہیں.... یہ گر گئی ہے۔"
"بدتمیز! میں تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا.... چلو اٹھاؤ اسے خود ہی۔" اس نے گرج دار آواز میں کہا۔ ساتھ ہی اس کے دوسرے گال پر تھپڑ لگا۔
محمود نے جھک کر بڑی مشکل سے شائلہ کو اٹھایا۔ وہ کافی وزنی تھی۔ اسے کندھے پر ڈالے وہ کسی نہ کسی طرح دوسروں کا ساتھ دیتا رہا۔ اب اس پر جھلاہٹ طاری ہو گئی تھی اور وہ کچھ نہ کچھ کر گزرنا چاہتا تھا، لیکن کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے۔
شائلہ کو اٹھائے اپنے خیمے میں داخل ہوا تو وہاں پہلے سے دوسرے لڑکے اور لڑکیاں آ چکے تھے، یہ تعداد میں نو تھے اور ان میں وہ چھ سالہ لڑکا بھی تھا۔ خیمے میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب نے مل کر

شاکر کو احتیاط سے زمین پر لٹا دیا۔

"کیا تم لوگ نئے ہو؟" ایک لڑکے نے پوچھا۔

"ہاں! آج ہی لائے گئے ہیں۔" محمود نے جواب دیا۔

"یا اللہ رحم!" ایک لڑکی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی اور پھر وہ شاکر کو اپنی قمیض سے ہوا کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد شاکر نے آنکھیں کھول دیں۔ خیمے کے ماحول کو دیکھ کر اس کا دم گھٹنے لگا۔

"کیا سب کو زمین پر سونا پڑتا ہے؟"

"اور کیا، یہاں بستر کون دے گا ہمیں۔" وہی لڑکا بولا۔

"میرا خیال ہے، پہلے ہم ایک دوسرے کے نام جان لیں.... میرا نام محمود ہے اور یہ شاکر ہیں.... اب آپ اپنے نام بتائیے۔"

"میں ضمیر ہوں، یہ شبو ہے....." وہ بتاتا چلا گیا، آخر میں اس نے اس چھوٹے سے لڑکے کا نام بتایا، اس کا نام گڈو تھا۔

"بہت خوب! کیا تم لوگوں نے یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا، کوئی منصوبہ نہیں بنایا؟" محمود نے پوچھا۔

"آہستہ بولو دوست اور ایسی بات بھی زبان پر نہ لاؤ، ورنہ ہم سب کی کوڑے مار مار کر کھال گرا دی جائے گی۔" ضمیر نے کہا۔

"لیکن ایسا جینا بھی کیا جینا ہے، اس سے تو بہتر ہے آدمی آزادی حاصل کرنے کی ایک کوشش ضرور کرے، زیادہ سے زیادہ

یہی ہوگا کہ وہ مر جائے گا یا پھر آزادی حاصل کرے گا۔"

"ایسی کوشش کرنے والوں کا انجام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔" شبو بولی۔

"وہ کوششیں سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر کی گئیں، خیر پہلے تو یہ بتاؤ.... تم لوگ یہاں کتنے عرصے سے ہو؟"

"کوئی ایک سال سے، کوئی دو سال سے، مجھے پانچ سال ہو گئے ہیں، گڈو کو آئے ابھی آٹھ ماہ ہوئے ہیں، یہ بے چارہ کیمپ میں سب سے چھوٹا ہے۔"

"کیوں گڈو، تمہیں اپنے ماں باپ کے نام یاد ہیں.... یا یہ پتا ہے کہ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"ماں باپ کے نام تو میں جانتا ہوں، میرے والد ایک دفتر میں ملازم ہیں، ان کا نام رشید احمد ہے، وہ میونسپل کارپوریشن کے دفتر میں کلرک ہیں.... ماں کا نام زبیدہ بیگم ہے، شہر کا نام مجھے نہیں معلوم، لیکن اگر مجھے میرے محلے کے باہر چھوڑ دیا جائے تو میں اپنے گھر پہنچ سکتا ہوں، لیکن ایسا ہو تو کب سکتا ہے، ایسا دن بھلا کہاں آئے گا، اب تو ساری زندگی یہیں گزرے گی، ٹھیک ہے نا ضمیر۔" گڈو یہ کہتے ہوئے بری طرح سسکنے لگا، اس کی ہچکی بندھ گئی، اس کی حالت دیکھ کر سب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، شاکر نے گڈو کو اپنے سینے

سے لگا لیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ خود محمود بھی اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا، اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ عین اسی وقت گھڑیال کی قسم کی کوئی چیز بجنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟"

"رات کا کھانا بٹنے کا اعلان ہے، اب ہم سب کو جا کر قطار میں لگ کر کھانا لانا ہوگا۔" ضمیر نے کہا۔

"اور کھانے میں کیا ہوتا ہے؟" شمائلہ نے جلدی سے پوچھا۔

"دو دو روٹیاں تنور کی اور ایک ایک پیالی دال ...... پانی جیسی پتلی .... جس میں برائے نام نمک مرچ ہوتا ہے۔" شبو نے کہا اور شمائلہ کو ابکائی آ گئی۔

"اور صبح کے وقت بھنے ہوئے چنوں کی ایک ایک مٹھی اور تھوڑا سا گڑ دیا جاتا ہے۔"

"اور دوپہر کو؟" محمود نے بوکھلا کر پوچھا۔

"دوپہر کو کچھ نہیں ملتا .... کچھ اپنے چنے بچا کر گزارا کرتے ہیں، کچھ رات کی روٹی بچا لیتے ہیں۔"

"اف خدا .... اتنا ظلم .... اتنا سخت کام اور اتنی گھٹیا اور کم خوراک ....." محمود کانپ اٹھا۔

"اور یہ خوراک کھاتے ہمیں مدت گزر گئی ہے۔" شبو نے روتے ہوئے کہا۔

پھر انہیں روٹی لانے کے لیے باہر جا کر لائن میں لگنا پڑا۔ لکڑی کے ایک چبوترے پر گیس لیمپ جل رہا تھا اور وہاں وہ تینوں غنڈے موتی، گنگو اور برنارڈ بیٹھے تھے۔ موتی دو دو روٹیاں ہر ایک کو دے رہا تھا، جو روٹی لینے والا گنگو کے سامنے جاتا، وہ اس کی پیالی میں دال ڈال دیتا اور برنارڈ مٹی کی صراحیوں میں پانی بھر بھر کر دیتا۔ ان کی باری آدھ گھنٹے بعد آئی، کھانا لے کر وہ اپنے چھپر میں آ گئے۔ محمود اور شمائلہ کے علاوہ وہ سب مر بھکوں کی طرح دال اور روٹی پر ٹوٹ پڑے بالکل اسی طرح جیسے ان کے سامنے دنیا کی بہترین نعمتیں رکھ دی گئی ہوں۔ محمود نے دو چار نوالے کھائے اور اس کے بعد اس سے نہ کھایا گیا، شمائلہ نے اب تک روٹی کو چھوا تک نہیں تھا۔

"شمائلہ! تھوڑا بہت کھا لو، بھوکے پیٹ تم حالات کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکو گی۔ ہمیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ ویسے ابھی تک سب لڑکوں اور لڑکیوں کو کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ملا تھا، ہمت والا یہاں نہیں آیا تھا، اب آ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ سب ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگے۔

"مطلب یہ کہ یہاں دو سو سے زائد لڑکے اور لڑکیاں ہیں اور تین کے قریب وہ ظالم، اگر ہم سب مل کر ہتھوڑے لے کر ان پر ٹوٹ پڑیں تو ایک ایک مرد کے حصے میں ہم اٹھارہ

اٹھارہ آتے ہیں اور جب اٹھارہ لڑکے اور لڑکیاں ہتھوڑے لے کر ایک آدمی کی مرمت شروع کریں تو اس سے زیادہ بے بس آدمی کوئی نہیں ہو سکتا .... یہ کام رات کے وقت نہایت اطمینان سے کیا جا سکتا ہے۔"

وہ سب سناٹے میں آ گئے۔ انہیں یہاں رہتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا تھا، لیکن کسی نے اتنی سامنے کی بات نہیں سوچی تھی۔

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، ہم بہت کم عقل اور کم ہمت تھے جو یہ بات نہ سوچ سکے۔"

"رات کو ہتھوڑے ہم سب کے پاس ہی ہوتے ہیں نا؟"

"ہاں!" ضمیر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"اور ہم ایک دوسرے کے خیموں میں بھی جا سکتے ہیں۔"

"ہاں! اس پر کوئی پابندی نہیں۔"

"اور یہ لوگ الگ ہٹ کر جو آٹھ دس خیموں کی قطار ہے، اس میں سوتے ہیں؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"تب تو رات کے وقت ان سے نمٹ لینا انتہائی آسان ہے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کی دہشت تم سب کے ذہنوں پر اس حد

تک چھا گئی ہے کہ کچھ کرنے کے بارے میں سوچتے بھی نہیں، اس لیے یہ خیال بھی کبھی نہیں آیا ہو گا، لیکن اب یہ خیال میں سب کو دلاؤں گا۔"

"کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔" شبو نے گھبرا کر کہا۔

"وہ تو پہلے ہی پڑے ہوئے ہیں۔"

محمود کے کہنے پر شمائلہ نے بھی بڑی مشکل سے اور منہ بنا کر چند لقمے کھائے، عین اسی وقت ٹامی اندر داخل ہوا، اسے دیکھ کر سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا، لیکن اس نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، صرف محمود اور شمائلہ کی طرف انگلی اٹھا کر بولا:

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہاں سوالوں کے جواب نہیں دیے جاتے، آئندہ ایسی غلطی پھر نہ کرنا۔"

"بہت اچھا، کیا یہ بہت بڑی غلطی ہے؟" محمود نے منہ بنا کر کہا۔

"ہاں! بہت بڑی سے بھی زیادہ، اور یہ تم اب تک اٹھے کیوں نہیں؟"

"آؤ شمائلہ.... چلیں ان کے ساتھ۔" محمود نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں ٹامی کے پیچھے خیمے سے باہر نکلے، یہاں ٹھیکا اور ایک بدمعاش صورت کھڑا تھا، شاید یہ لوگ فارغ ہو چکے تھے۔ ان کے تیور اچھے نہیں تھے۔ دونوں نے محمود اور شائلہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ محمود نے دل ہی دل میں یا اللہ رحم کہا، پھر وہ انہیں ساتھ لے کر باس کے خیمے کی طرف بڑھے۔ اجازت ملنے کے بعد انہیں لے کر اندر داخل ہوئے تو باس نے کہا:

"تم میں سے انسپکٹر جمشید سے کس کا تعلق ہے؟"

یہ سوال ایسا تھا جس نے محمود کو زور سے چونکنے پر مجبور کر دیا، تاہم اس نے فوری طور پر خود قابو پایا اور بولا:

"فرمائیے، میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اچھی طرح جانتے ہو.... بہت خوب! یہ بتاؤ تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟"

"وہ میرے والد ہیں۔" اس موقعے پر اس نے جھوٹ بولنا نامناسب خیال کیا۔ دوسرے وہ ان کی زبان سے اپنے والد کا نام سن کر حیران بھی ہوا تھا۔

"خوب! پھر تو وہ بہت پریشان ہو گا، تمہاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو گا۔" باس نے خوش ہو کر کہا۔

"انھوں نے پریشان ہونا نہیں سیکھا۔" محمود بولا۔

"تمہیں یہ سن کر افسوس ہو گا کہ وہ یہاں تمہاری تلاش میں آیا تھا، لیکن مایوس ہو کر واپس جا چکا ہے.... کیونکہ یہاں اسے نہ تم نظر آئے، نہ کوئی اور لڑکا یا لڑکی، البتہ اس وقت یہاں بڑی عمر کے مزدور کام کر رہے تھے۔"

"اوہ!" محمود کے منہ سے نکلا، اس کے چہرے کا رنگ یک دم اڑ گیا، کیونکہ یہ سن کر اسے دھچکا لگا تھا۔ ان کا آ کر لوٹ جانا اس کے لیے انتہائی پریشانی کی بات تھی۔ تاہم اس نے دلیری سے کہا:

"وہ لوٹ گئے تو کیا ہوا، تم انہیں نہیں جانتے، وہ پھر آئیں گے۔"

"لیکن اب وہ کیوں آئے گا، اس نے دیکھ لیا ہے کہ یہ کوئی بے گار کیمپ نہیں ہے۔" باس نے جھلا کر کہا۔

"میں کہہ چکا ہوں، تم انہیں نہیں جانتے۔"

"خیر! وہ جب بھی یہاں آئے گا، اسے یہاں کچھ نہیں ملے گا اور اگر اس نے زیادہ تنگ کیا تو اس کا بھی کانٹا نکال دیا جائے گا۔" باس نے پر غرور لہجے میں کہا، پھر ٹامی سے بولا۔

"ان دونوں کو واپس خیمے میں چھوڑ آؤ اور پہرے داروں کو چوکس کر دو، رات بھر کتوں کو کھلا رکھو۔"

"او کے باس!"

واپسی پر محمود بہت پریشان تھا ، وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا ۔ خیمے میں پہنچ کر اس نے شائستہ کی آواز سنی :

" تو آپ انسپکٹر جمشید کے بیٹے ہیں ، مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے ۔ اب یقیناً ہماری رہائی کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی ۔"

" فی الحال تو مایوسی ہی پلے پڑی ہے ۔"

" اور مایوسی گناہ ہے ۔"

" ہاں ! مایوسی گناہ ہے ، انسان کو اپنی کوشش کرتے رہنا چاہیے اور خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے ، ایسا کرنے والوں کو اس کی مدد ضرور پہنچتی ہے ۔"

" خدا کرے ، ایسا ہی ہو ۔" شائستہ اور کچھ دوسروں کے منہ سے نکلا ۔

خیمے میں موجود چند دوسرے لڑکوں کو بھی انسپکٹر جمشید اور ان کے بارے میں تھوڑا بہت معلوم تھا ۔ لہٰذا اب سب محمود کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ محمود نے محسوس کیا ، اب وہ ان سب کا لیڈر بن سکتا ہے ، اس نے سرگوشی میں کہا :

" دیکھو دوستو ! اگر تم لوگوں نے میرے کہنے پر عمل کیا تو میں چند دن کے اندر اندر تمہیں اس اندھیر نگری سے نکال لے جاؤں گا ، ورنہ ساری زندگی تمہیں ایڑیاں رگڑتے ہوگے ۔"

" ہم وہی کریں گے ، جو تم کہو گے ۔" شائستہ بولی ۔

" ہم سب بھی تیار ہیں ۔"

" اچھا تو پھر کل جب تم پتھر توڑ رہے ہو گے تو تم میرا پیغام سرگوشیوں میں دوسروں تک نہایت احتیاط سے پہنچا دینا کہ وہ سب ذہنی طور پر حملے کی تیاری کر لیں ۔"

" دن کے وقت یہ پیغام دینا بہت مشکل ہو گا ، یہ کام اس وقت کیا جا سکتا ہے ، ہم سینے کے بل رینگ کر ایک ایک خیمے میں جا کر ..... پیغام پہنچا سکتے ہیں ، ہم میں سے ہر ایک ایک خیمے میں جائے گا ۔ اس طرح ہم ایک وقت میں گیارہ خیموں میں اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں اور یہ کام ایک گھنٹے کے اندر اندر مکمل کر لیں گے ۔" قطبو نے ترکیب بتائی ۔

" کیا رات کے وقت خیموں کے باہر پہرہ نہیں ہوتا ؟" محمود نے پوچھا ۔

" نہیں ، پہرہ میناروں پر ہی ہوتا ہے اور اس کے ذریعے اندر کی طرف ٹارچ کی روشنی ڈال کر یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو رہی ، ہمیں بس اتنا کرنا ہو گا کہ ٹارچ کی روشنی سے بچ کر دوسرے خیموں میں پہنچ جائیں ۔" منیر نے بتایا ۔

" بہت خوب ! تو پھر ہم یہ کام اسی وقت سے شروع کریں گے ۔" محمود بولا ۔

" میرے خیال میں یہ وقت مناسب نہیں رہے گا ۔ ابھی پاس اور

دوسرے لوگ جاگ رہے ہیں، کم از کم یہ لوگ سو جائیں، کیونکہ ان کے سونے کے بعد پہرے دار بھی اتنے چوکس نہیں رہتے ہوں گے۔" شبو نے کہا۔

"بہت خوب! آپ بہت ذہین ہیں، ہم یہی کریں گے، رات بھیگ جانے دو، پھر اس مہم کا آغاز کریں گے۔"

"حملے کی تفصیلات کیا ہیں؟" ضمیر نے پوچھا۔

"آج ہم صرف پیغام پہنچائیں گے، کل رات بارہ بجے حملہ ہوگا۔ ہم سب اپنے خیموں سے رینگتے ہوئے نکلیں گے، ہمارے ہاتھوں میں ہتھوڑے ہوں گے۔ ہر خیمے کو چوتھائی چوتھائی لڑکے اپنے گھیرے میں لے لیں گے، کیونکہ یہ بدمعاش ایک خیمے میں تین تین سوتے ہیں، پھر میں ایک ہلکا سا اشارہ دوں گا..... اور سب لوگ خیموں پر ٹوٹ پڑیں گے، لیکن نہیں، اس کے ساتھ ہم ان میناروں کو بھی گھیرے میں لیں گے، اگر اوپر جانے کا راستہ کھلا ہوا تو دبے پاؤں اوپر پہنچ جائیں گے، ورنہ ان کے نیچے اترنے کا انتظار کریں گے، ظاہر ہے گڑبڑ دیکھ کر وہ نیچے ضرور اتریں گے۔"

"بہت خوب! پروگرام شاندار ہے۔" شبو نے اطمینان سے کہا۔

نہ جانے کتنی دیر تک وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے، آج نیند ان کی آنکھوں سے دور جا چکی تھی..... ابھی وہ

دوسرے خیموں میں جانے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ ایک آواز نے محمود کو اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ کھل اٹھا، فوراً ہی اس نے بھی حلق سے ویسی ہی آواز نکالی۔ شاکر، ضمیر، شبو اور دوسرے اسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

بڑا مجرم

انسپکٹر جمشید نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر اُلّو کی آواز نکالی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی انہیں جواب مل گیا اور تینوں کے چہروں پر رونق دوڑ گئی۔

" اُف خدا! محمود تو اندر ہی موجود ہے " فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

" اب ہم کیا کریں، اسے کیسے نجات دلائیں، اس کے ساتھ یقیناً شائستہ بھی ہو گی " فاروق نے فکر مند ہو کر کہا۔

" اب تو مجھے پھر یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ مجرموں کا کیمپ ہی ہے " انسپکٹر جمشید بولے۔

" اس کا مطلب ہے، جس وقت ہم نے کیمپ کا اندر سے معائنہ کیا تھا، انہوں نے اغوا شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کو کہیں چھپا دیا تھا " فرزانہ نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

" ہم ان لوگوں کو مہلت نہیں دیں گے .... فوری طور پر چھاپہ مارنے کا انتظام کرنا چاہیے " انسپکٹر جمشید بولے۔

" لیکن ابّا جان! حملے کی صورت میں اگر انہوں نے اندر موجود لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنا نشانہ بنانا شروع کر دیا تو؟ " فاروق نے خطرہ ظاہر کیا۔

" ہاں! یہ بھی ممکن ہے، ہمیں جو قدم بھی اٹھانا ہے سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے ...."

" چھاپہ مارنے کی صورت میں خطرہ ہی خطرہ ہے، ہمیں کچھ اور کرنا ہو گا " فرزانہ بولی۔

" مثلاً کیا، تم ہی بتاؤ "

" اگر ہم کسی طرح اندر داخل ہو کر محمود کے پاس پہنچ جائیں تو اندر کے تمام حالات سے باخبر ہو سکتے ہیں اور اس صورت میں ہمارے لیے کوئی راستہ منتخب کرنا آسان ہو گا " فرزانہ نے جواب دیا۔

" یہ بات میرے بھی دل کو لگتی ہے "

" اندر داخل ہونا کچھ مشکل نہیں، میں اس کا بندوبست کر کے آیا ہوں، لیکن اس وقت میرے پاس صرف ایک پستول ہے "

" لیکن اس وقت تک سب لوگ سو چکے ہوں گے " فرزانہ بولی۔

" اچھا تو پھر آؤ، بسم اللہ کریں "

" اور کتّوں کا کیا ہو گا "

" کتّے .... میں انہیں پستول کا نشانہ بناؤں گا .... پستول پر

سائلینسر فٹ ہے پہلے چونکہ محمود کی موجودگی کا علم نہیں تھا، اس لیے میں کتوں کو گوشت میں دوا ملا کر دینا چاہتا تھا، تاکہ وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے بے ہوش ہو جائیں اور یہاں کے لوگوں کو شبہ نہ ہو، لیکن اب جب کہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ہمارا واسطہ مجرموں سے ہے، تو پھر ان کے کتوں کو مارنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"بلکہ اب تو ہم انہیں بھی گولیوں کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔"

انسپکٹر جمشید جیپ تک واپس گئے اور اس میں سے ربڑ کی ایک چادر نکال کر لے آئے.... باڑھ کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے چادر اچھال کر باڑھ پر ڈال دی۔ اب اس کے اوپر چڑھ کر دوسری طرف کودنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوسری طرف تھے۔ ساتھ ہی ایک کتے کی خوفناک غراہٹ سنائی دی۔ لیکن پھر اس کی غراہٹ آہستہ ہوتی چلی گئی۔ انسپکٹر جمشید نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ اچانک انہوں نے ایک ٹارچ کی روشنی کو اس طرف آتے دیکھا۔ وہ فوراً دوسری طرف کھسک گئے۔ ٹارچ کی روشنی کتے کی لاش پر آ کر رک گئی۔ پھر کسی نے کہا۔

"ارے! یہ ٹائیگر کو کیا ہوا، کیا اسے نیند آ گئی ہے؟"

"ابھی ابھی غرایا تو بہت زور سے تھا، ٹھہرو میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

ان کی آوازیں فاروق اور فرزانہ نے بھی سنیں، لہٰذا وہ باہر ہی دبکے رہے.... ادھر انسپکٹر جمشید آنے والے شکار کی تاک میں تھے۔ جونہی وہ کتے کی لاش کے قریب پہنچا، ان کے پستول سے ایک اور گولی نکلی اور وہ دھڑام سے کتے کے اوپر گر گیا۔ اس کے گرنے کی آواز اس کے ساتھی نے بھی سن لی:

"کیا ہوا بالے؟"

لیکن بالا بے چارہ کیا جواب دیتا۔ فوراً ہی سیڑھیاں اترنے کی آواز سنائی دی اور تین آدمی نیچے اتر کر بالے کی طرف بڑھے۔ انسپکٹر جمشید نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے اور وہ تینوں ڈھیر ہو گئے۔ اس کے بعد فضا میں سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر کسی نے مینار پر سے کچھ نہیں پوچھا۔

"آ جاؤ بھئی، اب راستہ صاف ہے۔" انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

فاروق اور فرزانہ ربڑ کی چادر پر سے ہوتے ہوئے ان تک پہنچ گئے۔ اب انہوں نے آگے بڑھ کر ان چاروں آدمیوں کا جائزہ لیا، وہ ختم ہو چکے تھے۔ ان کی ٹارچیں اور رائفلیں گنیں ان کے آس پاس پڑی تھیں۔ سٹین گنوں اور ٹارچوں

پر انھوں نے قبضہ کر لیا ۔ اس وقت ایک اور کتے کی غراہٹ سنائی دی۔ وہ فوراً مڑے ۔ انسپکٹر جمشید نے اس سمت میں ٹارچ کی روشنی ڈالی ۔ کتا آندھی اور طوفان کی طرح آ رہا تھا۔ انھوں نے اپنی پستول سے نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا ۔ کتا کئی فٹ اونچا اچھلا اور ڈھیر ہو گیا۔

"اب اگر کوئی اور کتا بھی آیا تو اس کا آپ کیا کریں گے؟"

"ابھی میرے پستول میں ایک گولی اور ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

وہ اس جگہ سے آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک اور کتا ان کی طرف جھپٹا اور اس کا بھی وہی حشر ہوا ۔ ابھی وہ سنبھلے ہی نہیں تھے کہ چوتھا کتا غراتا ہوا آیا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ، میں اس کا مقابلہ کروں گا۔" انھوں نے کہا پھر جلدی سے بولے: "ٹارچیں روشن رکھو۔"

کتے نے ان پر چھلانگ لگائی ، لیکن وہ پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئے ۔ کتا خاردار تاروں سے ٹکرایا ۔ وہ تیزی سے اٹھا اور پھر ان کی طرف آیا ، لیکن ابھی راستے ہی میں تھا کہ فرزانہ کے شاٹ گن کا بٹ گھما کر اس کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ چکرا کر گرا۔ ساتھ ہی ایک بٹ فاروق نے اس کے سر پر دیا اور کتے کے دم خم ختم ہو گئے۔

"ابا جان ! ہم نے اس قسم کے چار مینار سے یہاں دیکھے تھے ، اگر ایک مینار سے چار آدمی اترے ہیں تو باقی تینوں میناروں پر بھی ضرور چار چار آدمی ہوں گے ۔" فاروق نے کہا۔

"ہوں ! ٹھیک ہے ، لیکن تم ان کی فکر نہ کرو ، ہمیں سب سے پہلے محمود تک پہنچنا ہے ۔" یہ کہہ کر انھوں نے ایک دبی دبی سی آلو کی آواز نکالی۔ فوراً ہی انھیں جواب ملا...... اور وہ آواز کی سمت میں چلنے لگے۔ ٹینیں گنیں انھوں نے ہاتھوں میں لے لی تھیں ۔ پندرہ منٹ تک چلتے رہنے کے بعد وہ خیموں کی قطار تک پہنچ گئے ۔ اب انسپکٹر جمشید نے سرگوشی نما ایک آواز نکالی ۔ محمود خیمے سے پہلے ہی باہر آ چکا تھا...... فوراً ان کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے ۔ اب وہ انہیں اپنے خیمے میں لے آئے تو کے لڑکے اور لڑکیاں انسپکٹر جمشید کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ محمود نے جلدی جلدی انہیں تمام حالات کہہ سنائے۔ انسپکٹر جمشید نے چوتھی ٹین محمود کو دے دی اور باقیوں سے کہا:

"تم سب اپنے اپنے ہتھوڑے ہاتھوں میں لے لو...... اور میرے پیچھے آؤ ، حلق سے آواز نہ نکلے۔"

پنجوں کے بل رینگتے ہوئے وہ باہر نکلے اور خیموں کی دوسری قطار کی طرف بڑھنے لگے ۔ سب سے پہلے خیمے کے قریب پہنچ

کر انسپکٹر جمشید نے محمود سے کہا:

"اپنا چاقو مجھے دو۔"

اس نے جوتے کی ایڑی سے چاقو نکال کر انہیں دیا۔ اس کی مدد سے انہوں نے ایک خیمے میں شگاف ڈالا اور انہیں باہر ہی ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اندر مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا، تین پلنگ بچھے تھے۔ ان تینوں پر تین آدمی گہری نیند سو..... رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے اب محمود، فاروق اور فرزانہ کو اشارہ کیا۔ وہ اندر داخل ہو گئے اور ان تینوں کے سینوں پر سٹین گنوں کی نالیں رکھ دیں۔ نالوں کا دباؤ پڑا تو ان کی آنکھ کھل گئی، چند سیکنڈ تک تو وہ کچھ بھی نہ سمجھے کہ کیا معاملہ ہے اور جب معاملہ ان کی سمجھ میں آیا تو ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ انسپکٹر جمشید نے جیب سے باریک ڈوری نکالی اور انہیں جلدی جلدی چارپائیوں کے ساتھ ہی جکڑنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ان کے منہ کے اندر کپڑے ٹھونس دیے اور منہ بھی باندھ دیے۔ اس خیمے سے فارغ ہو کر وہ دوسرے خیمے کی طرف بڑھے۔ ان سب کو ادھر ادھر چھپا دیا اور پھر منارے پر سٹین گن کا برسٹ ڈھیرے ڈھیرے دو تین دفعہ مارا۔ ادھر سے سرگوشی میں کہا گیا:

"نیچے کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے..... آؤ چل کر دیکھیں۔"

جونہی چار آدمی نیچے اترے، ان کے سروں پر ایک ساتھ کئی کئی ہتھوڑے برس پڑے۔ بے ہوش ہوتے ہوئے انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں حیرت کا ایک سمندر اتر آیا۔ تیسرے اور پھر چوتھے مینارے والوں کا بھی یہی حشر ہوا، ان سب کو بھی باندھ دیا گیا۔ اب کوئی اور باقی نہیں رہا تھا۔ اب انہوں نے ظہیر اور شبو وغیرہ کو ان کے ساتھیوں کو جگانے کا حکم دیا۔ خیموں میں زندگی اور ہل چل نظر آنے لگی، جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ آزاد ہو گئے ہیں تو خوشی ان سے برداشت نہ ہو سکی، بے تحاشہ اچھلنے اور کودنے لگے۔ وہ انسپکٹر جمشید کے گرد جمع ہو گئے اور ناچنے لگے، انسپکٹر جمشید انہیں روکتے ہی رہ گئے مگر انہوں نے ان کی ایک نہ سنی۔ ان کا ناچ تیزی اختیار کرتا چلا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے خوشی نے انہیں پاگل کر دیا ہو۔

اور پھر سورج طلوع ہو گیا۔ آج کا سورج اس وادی کے لیے خوشیوں کا پیغام لایا تھا۔ تمام مجرموں کو اسی حالت میں باہر لایا گیا کہ ان کے ہاتھ کمر پر بندھے تھے۔ خاردار باڑھ کا گیٹ بند تھا۔ ان سب کو اسی میدان میں لایا گیا جہاں آج سے پہلے تک پتھر توڑنے کا کام ہوتا رہا تھا۔ گیٹ کے قریب مجرموں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ انسپکٹر جمشید نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس قطار میں کھڑے لوگوں کے چہروں کو

بغور دیکھا اور اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ ان کا باس ان میں نہیں تھا۔

"تمہارا باس.... کیا یہاں نہیں سوتا؟"

"جی نہیں.... وہ رات ہوتے ہی شہر چلے جاتے ہیں اور دن نکلتے ہی آ جاتے ہیں۔" نامی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"وہ اکیلا یہاں سے جاتا ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا ہے؟"

"ان کے ساتھ استاد ہوتا ہے۔"

"استاد!.... استاد کون؟"

"ہم اسے اسی نام سے جانتے ہیں، اگر اس کا اصل نام کوئی اور ہے تو وہ باس کو معلوم ہوگا۔" نامی نے کہا۔

"ابا جان! استاد بہت موٹا تازہ آدمی ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہے، وہ ہمیں سب سے پہلے اس مکان میں ملا تھا.... یعنی جنگل والے مکان میں۔"

"خیر.... لیکن وہ اب تک ادھر آئے کیوں نہیں؟"

"ہو سکتا ہے وہ آئے ہوں، لیکن بدلے ہوئے حالات دیکھ کر پلٹ گئے ہوں.... اور یہ اس طرح کہ انہوں نے گیٹ پر چوکیداروں کو موجود نہیں پایا ہوگا اور میناروں پر ان کے ساتھی نظر آئے ہوں گے۔"

"اوہ ہاں اور شاید انہوں نے باڑھ میں سے اندر مردہ پڑے

کتوں اور اپنے ساتھیوں کو بھی دیکھ لیا ہوگا، لہٰذا وہ بھاگ نکلے ہوں گے، خیر ان کے بارے میں بعد میں سوچیں گے، پہلے ان کا بندوبست کریں.... محمود، فاروق تم دونوں جیپ پر شہر جاؤ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملاقات کر کے انہیں سارے حالات بتاؤ، وہ انہیں گرفتار کر کے لے جانے کا بندوبست کر دیں گے، میرا نام لینا۔"

"جی بہتر!" محمود اور فاروق تو روانہ ہو گئے، ادھر ایک نیا کام شروع ہو گیا.... ہوا یہ کہ ایک لڑکے کو غصہ آ گیا، اس نے ایک ہتھوڑا کوڑا برسانے والے کی کمر پر دے مارا، وہ بلبلا اٹھا، بس پھر کیا تھا،..... تمام لڑکے اور لڑکیاں ان تیس کے تیس درندوں پر ہتھوڑوں سے پل پڑے، انسپکٹر جمشید ارے ارے کرتے ہی رہ گئے اور جب تک وہ چیخ چیخ کر انہیں ہٹانے میں کامیاب ہوئے، ان تیس کے تیس کا بھرکس نکل چکا تھا، ان میں سے اکثر کے سر پھٹ گئے تھے اور بہت سوں کے منہ اور ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ یہ منظر بھی عجیب منظر تھا.... اس منظر کو دیکھ کر بچوں نے بے ساختہ تالیاں بجا دیں.... پھر ایک لڑکے نے بلند آواز میں ایک نعرہ لگایا:

"انسپکٹر جمشید!"

"زندہ باد۔" سب کے سب دل کی گہرائیوں سے چلا اٹھے۔

دوسرے دن کے اخبارات نے گویا ملک بھر میں قیامت برپا کر دی، دارالحکومت میں تو لوگ اپنا اپنا کاروبار چھوڑ کر سڑکوں پر نکل آئے ..... اس ہجوم نے ایک جلوس کی صورت اختیار کر لی، جلوس نے گورنر ہاؤس کے سامنے پہنچ کر دم لیا، پورا جلوس ایک ہی نعرہ لگا رہا تھا، "مجرموں کو ..... پھانسی دو ..... مجرموں کو پھانسی دو۔"

ادھر یہ عالم تھا اور ادھر انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ آئی جی صاحب کے دفتر میں موجود تھے، محمود کے ذہن میں اس کار کے نمبر ..... ابھی موجود تھے، اس کے مالک کا پتا جب رجسٹریشن کے ذریعے لگایا گیا تو ایک حیرت انگیز بات معلوم ہوئی، وہ کار وزیر اعلیٰ کے ایک رشتے کے بھائی کی تھی۔ آئی جی صاحب بھی سکتے میں رہ گئے، اسی وقت سر ہارون وہاں پہنچ گئے، انہیں بھی یہ بات معلوم ہوئی تو انگلی دانتوں میں دبا لی اور پھر بولے:

"وزیر اعلیٰ میرے بہترین دوست ہیں، لہٰذا میں یہی درخواست کروں گا کہ مجرم کو گرفتار نہ کیا جائے، اور میرا خیال ہے، وزیر اعلیٰ بھی یہی کہیں گے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب!" انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

"خیر! آپ کی مرضی ....." سر ہارون نے کندھے اچکاتے پھر

بولے: "بہر حال میں زندگی بھر آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گا، یہ آپ ہی ہیں جن کی وجہ سے میری بچی مجھے واپس ملی۔"

"یہ تو میرا فرض تھا جناب اور پھر میرا اپنا بیٹا ان کے جنگل میں پھنس گیا تھا۔"

سر ہارون کے جانے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"جناب! میں قادر بخت خان کو گرفتار کرنے جا رہا ہوں، امید ہے، آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"لیکن بھئی! اب تم اس کے خلاف ثبوت کیا پیش کرو گے، ظاہر ہے، وہ موقعے پر گرفتار نہیں ہو سکا۔"

"جناب عالی! اس جگہ کا ٹھیکہ اس کے نام ہے، دو سو کے قریب لڑکے اور لڑکیاں اس کے خلاف گواہی دیں گی، اس کے علاوہ میں خود بھی اسے کیمپ میں دیکھ چکا ہوں ..... اس کے ساتھی استاد نامی کو شاکر اور محمود جنگل والے مکان میں دیکھ چکے ہیں، وہ میز وغیرہ کی سطح پر نو کا ہندسہ لکھنے کا عادی ہے، وہ جہاں بھی ہوگا، وہاں کی میزوں پر نو کا ہندسہ اس کے خلاف ثبوت ہوگا اور جب ان پر تھرڈ ڈگری استعمال کی جائے گی تو وہ فرفر بول اٹھے گا کہ قادر بخت ہی اصل مجرم ہے۔"

"میں تمہیں روکوں گا نہیں، لیکن یہ جان لو کہ وزیر اعلیٰ کو صدر مملکت بہت پسند کرتے ہیں، اگر اس نے صدر صاحب کی

سفارش کرا دی تو کیا ہو گا۔"

"خیر... دیکھا جائے گا... ارے ہاں یہ تو بتائیے، بچوں کی واپسی کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟"

"ریڈیو اور ٹی وی پر یہ اعلان برابر کیا جا رہا ہے کہ آٹھ دس سال کے دوران جن لوگوں کے بچے اغوا ہوئے اور مل نہیں سکے، وہ محکمہ سراغرسانی کی عمارت میں تشریف لا کر اپنے بچوں کو پہچان لیں۔"

"چلیے ٹھیک ہے... اب میں اجازت چاہوں گا۔"

"بہت اچھا، میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔"

"فکر نہ کریں جناب، وہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔"

یہ کہہ کر وہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو لے کر باہر آئے۔ انہوں نے اکرام، محمد حسین آزاد اور چند کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور دو جیپوں پر یہ چھوٹا سا قافلہ روانہ ہو گیا۔

تین گھنٹے کے سفر کے بعد جیپیں ایک عالی شان محل نما کوٹھی کے سامنے رک گئیں۔ انسپکٹر جمشید نے نیچے اتر کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ فوراً ہی بڑی بڑی مونچھوں والے ایک ملازم نے گیٹ کھولا۔

"جناب اندر ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

ان کے منہ سے جی ہاں سنتے ہی وہ اندر گھس پڑے۔ ان کے ساتھ ان کے ساتھی بھی اندر چلے آئے۔

"ارے ارے... یہ کیا؟... جناب آپ بغیر اجازت اندر داخل نہیں ہو سکتے۔"

"چھوڑو بھئی، ہمیں اجازت کی ضرورت نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ ملازم ان کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدحواسی کے آثار طاری ہو گئے تھے۔

"ابا جان! وہ دیکھیے۔" فرزانہ نے تقریباً چلا کر کہا۔

انہوں نے بائیں طرف دیکھی۔ ایک سرسبز لان میں قادر بخت خان اور استاد ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنا رخ اسی طرف کر لیا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا اور پھر مسکرانے لگے۔ یہ لوگ قریب پہنچے تو انہیں اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہ استاد اور قادر بخت خان ہی تھے۔

"کیا بات ہے خان... یہ لوگ بغیر اجازت اندر کیسے آ گئے؟" قادر بخت خان نے منہ بنا کر کہا۔

"زبردستی صاحب جی... میں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن یہ رکے ہی نہیں۔"

"تو پھر جاؤ اور پولیس کو فون کرو۔"

"بہت بہتر صاحب۔" ملازم نے کہا اور عمارت کے برآمدے کی

طرف چلا گیا۔

"میں آپ دونوں کو گرفتار کرنے آیا ہوں، لہٰذا پولیس آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکے گی" انسپکٹر جمشید نرم آواز میں بولے۔

"مجھے گرفتار کرنے آئے ہو، آئینے میں منہ دیکھا ہے کبھی اپنا"

"تمہیں گرفتار کرنے کے لیے مجھے اس کی ضرورت نہیں"

"وارنٹ گرفتاری ہے تمہارے پاس"

"ہاں! یہ رہا" انہوں نے وارنٹ دکھائے۔

"میں پھر بھی گرفتاری نہیں دوں گا" اس نے کہا۔

"ہم آپ کو زبردستی گرفتار کریں گے" انسپکٹر جمشید بولے، ساتھ ہی ان کے ہاتھ میں پستول نظر آیا اور انہوں نے اکرام اور محمد حسین آزاد کو اشارہ کیا۔ دو کانسٹیبلوں کو لے کر آگے بڑھے اور ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

"تم سب کی شامت آگئی ہے، یوں سمجھ لو کہ تم نے اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو لیے ہیں" اس نے غرا کر کہا۔

"پروا نہیں، لیکن ہم تمہیں ضرور گرفتار کر کے لے جائیں گے"

"تم مجھے ایک دن سے زیادہ حوالات میں نہیں رکھ سکو گے، لکھ لو"

"میں اپنا قلم گھر بھول آیا ہوں، لہٰذا لکھ نہیں سکتا" انسپکٹر

جمشید نے کہا... فاروق نے انہیں حیران ہو کر دیکھا.... جیسے کہہ رہا ہو.... ابا جان! یہ جملہ آپ نے ادا کیا ہے۔

"چلو بھئی.... لے چلو انہیں"

کانسٹیبل انہیں گھسیٹنے لگے۔ اسی وقت ملازم وہاں آگیا۔ اس نے اس منظر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پھر اس کے منہ سے نکلا:

"صاحب جی۔ یہ کیا"

"بھائی صاحب کو فون کر کے حالات کی خبر کر دو، انہیں بتا دو کہ مجھے زبردستی گرفتار کر لیا گیا ہے"

"بہت بہتر صاحب جی" اس نے کہا اور ایک بار پھر فون کی طرف دوڑ گیا۔

دونوں کو باہر لایا گیا پھر ایک جیپ میں بٹھا کر انہوں نے دفتر کا رخ کیا۔ راستے بھر وہ بکواس کرتا رہا، غلیظ گالیاں بکتا رہا۔ دفتر پہنچتے ہی ان کے چپراسی نے بتایا:

"آئی جی صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں"

وہ اسی وقت ان کے کمرے میں پہنچے:

"بھئی جمشید! وہی ہوا جس کا ڈر تھا"

"جی۔ کیا مطلب"

"ابھی ابھی وزیر اعلیٰ کا حکم آیا ہے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے.... ان کے اس حکم کے بعد ہم انہیں گرفتار نہیں رکھ سکتے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب! اتنے بڑے ایک مجرم کو قانون اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتی۔ میں وزیرِ اعلیٰ سے بات کرتا ہوں"۔

"وہ خود تم سے بات کرنا چاہتے ہیں اور فون پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں"۔

"بہت خوب!" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور نمبر ڈائل کیے۔ سلسلہ فوراً ہی مل گیا۔

"ہیلو! سر میں انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں"۔

"ہیلو جمشید.... بھئی یہ قادر بخت خاں کا کیا چکر ہے"؟

"کیا ابھی تک آپ کو تفصیلات کا علم نہیں ہوا جناب عالی"۔

"بہت کم...." انہوں نے کہا۔

"تو پھر تفصیل سے میں بتاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر انہوں نے کیمپ کی ساری داستان سنا دی۔ پھر جلدی سے بولے:

"اب آپ ہی بتائیں.... انہیں کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے، لوگ قیامت برپا کر دیں گے"۔

"لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصل مجرم کون ہے، تیس کے قریب آدمی تو گرفتار ہو ہی چکے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو اصل مجرم بنا دو"۔

"یہ میں نہیں کر سکتا جناب!"

"بھئی وہ میرا بھائی ہے.... اگر اسے سزا ہو گئی تو میں

اس ملک میں کس منہ سے رہ سکوں گا"۔

"سر! یہ میرا مسئلہ نہیں ہے"۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

"تب پھر.... میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اسے آزاد کر دو"۔

"سوری سر! میں ایسا نہیں کر سکتا"۔

"کیا کہا...." وزیرِ اعلیٰ چلائے۔

"جی ہاں! میں ایسا نہیں کر سکتا"۔

"کیا کہا...." وزیرِ اعلیٰ پھر چلائے۔

"جی ہاں! میں ایسا نہیں کر سکتا"۔

"بہت بہتر! میں تمہیں دیکھ لوں گا"۔ دوسری طرف سے چلا کر کہا گیا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

انسپکٹر جمشید نے بھی سلسلہ منقطع کر کے جلدی جلدی کسی کے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔

"جمشید.... تم انگاروں سے کھیل رہے ہو"۔ آئی جی صاحب پریشان ہو کر بولے۔

"ساری زندگی انگاروں سے ہی تو کھیلتا رہا ہوں جناب.... یہ کونسی نئی بات ہے"۔ انسپکٹر جمشید بولے۔ ساتھ ہی سلسلہ مل گیا۔ انہوں نے فون میں کہا۔

"میں انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ ایک فوری ضرورت کے تحت صدرِ مملکت سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔

"وہ فون پر کسی سے بات کر رہے ہیں، انتظار کیجیے۔"

"اچھی بات ہے۔"

تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے کہا گیا:

"بات کیجیے جناب!"

"السلام علیکم سر! یہ میں ہوں، اس ملک کا خادم انسپکٹر جمشید۔"

"جمشید! میں خود تمہیں فون کرنے والا تھا، بھئی یہ وزیر اعلیٰ کے بھائی کا کیا چکر ہے؟"

"تو انہوں نے مجھ سے پہلے آپ کو فون کر دیا ہے۔"

"ہاں! تم یوں کرو کہ ان کے بھائی کو چھوڑ دو اور مجھ سے آکر مل لو، میں نے وزیر اعلیٰ کو بھی یہیں بلا لیا ہے۔"

"ایک منٹ سر! پہلے میری گزارش سن لیجیے۔"

"ہاں .... ضرور .... کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

انسپکٹر جمشید نے کیمپ کی کہانی مختصر لفظوں میں سنا دی۔ صدر مملکت سوچ میں پڑ گئے، آخر بولے۔

"اچھا اسے حوالات ہی میں رہنے دو اور مجھ سے آکر ملاقات کر لو۔"

"جی بہت بہتر!" انسپکٹر جمشید مسکرائے، یہ ان کی وزیر اعلیٰ کے مقابلے میں پہلی فتح تھی۔

وہ اسی وقت محمود، فاروق اور فرزانہ کو ساتھ لے کر

روانہ ہو گئے۔ وزیر اعلیٰ وہاں موجود تھے۔ ان کا منہ پھولا ہوا تھا۔ صدر صاحب ان سے نرم لہجے میں بات کر رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید کو دیکھ کر وہ انہیں اپنے ساتھ ایک الگ کمرے میں لے گئے۔

"دیکھو بھئی .... ہمارے وزیر اعلیٰ کی کمر پر ایک بہت بڑے ملک کا ہاتھ ہے .... اس ملک سے ہمیں بہت بھاری امداد بھی ملتی ہے، ایسا نہ ہو، وزیر اعلیٰ کے ساتھ ساتھ وہ ملک بھی ہمارے خلاف ہو جائے۔"

انسپکٹر جمشید سناٹے میں آ گئے۔ کئی سیکنڈ تک سوچنے کے بعد انہوں نے کہا:

"سر! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ انصاف کا خون نہ ہو، اگر آج ان کے بھائی کو چھوڑ دیا گیا تو کل نہ جانے کس کس کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور اس طرح ہمارا قانون قانون نہیں، ایک مذاق بن جائے گا..... اگر آپ انہیں رہا ہی دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر میں یہ بھی گزارش کروں گا کہ مجھے بھی ملازمت سے الگ کر دیا جائے .... آپ کو معلوم ہونا چاہیے جناب عالی کہ ہمارے پیارے نبی سرور کائنات، فخر موجودات نے یہی فرمایا تھا کہ بڑی بڑی قومیں اس لیے تباہ ہو گئیں کہ ان کے سربراہ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو ان کے جرائم پر سزا نہیں دیتے

تھے..... آپ نے یہ تک فرمایا تھا کہ اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔

صدرِ مملکت کی آنکھیں بھیگ گئیں، رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سن کر ان پر لرزا طاری ہو گیا، انہوں نے کہا:

"میرے پیارے رسولؐ نے جو فرمایا تھا، وہی کرنا چاہیے..... وہی ہو گا۔"

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ
انسپکٹر جمشید کا سیریز ۳۶

دوھری چال

مصنف: اشتیاق احمد

- آئی جی صاحب کے ایک دوست کو دھمکی آمیز خط ملا۔
- انسپکٹر جمشید اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچے تو ایک عجیب حادثے کا شکار ہو گئے۔
- محمود، فاروق اور فرزانہ پر ایک شخص چکر بازی کا الزام لگاتا ہے۔
- فاروق اور فرزانہ کو ایک کباڑ خانے میں حیرت کا سامنا۔
- ایک پری کی کہانی، محمود، فاروق اور فرزانہ پری سے ٹکرا جاتے ہیں۔
- پری کون تھی..... سارا چکر کیا تھا، ایک حیرت بھری کہانی۔

قیمت: ۵/۵۰

علاشا کا زلزلہ کا انعامی سوال

میرا پسندیدہ جملہ یہ تھا: "یہ زندگی گزارنا اپنے آپ سے جنگ کرنا ہی تو ہے۔"

صرف تین صحیح جملے موصول ہوئے۔ ان کی قرعہ اندازی کی گئی۔ قرعہ اندازی کے مطابق -/۵۰۰ روپے کا انعام، انعام کے حق دار کو روانہ کیا جا رہا ہے۔ باقی دو حضرات کو -/۱۰۰، -/۱۰۰ روپے کا انعام اعزازی طور پہ دیا جا رہا ہے، اگرچہ اس قسم کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ فیصلہ صرف یہ کیا گیا تھا کہ ایک شخص کو -/۵۰۰ روپے کا انعام دیا جائے گا۔ انعام کو تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

انعام پانے والے خوش نصیب درج ذیل ہیں

۱۔ اول انعام مبلغ -/۵۰۰ روپے، نبیلہ صفدر، مکان نمبر ۴۴، ٹرسٹ کالونی رحیم یار خان۔

۲۔ دوسرا انعام مبلغ -/۱۰۰ روپے، ظاہر، مینا بازار۔ گھر نمبر ۹۸، پشاور

۳۔ تیسرا انعام " " " " " بدر منیر الطہر ۶/۱ علاؤ الدین صاحب محلہ فاروق پارک، جلالپور جٹاں، (گجرات)

نوٹ: اگر یہ تینوں حضرات اپنی تصویر شائع کرانا چاہیں تو ارسال کر سکتے ہیں۔

اشتیاق احمد

دوھری چال کا انعامی سوال

س: آخری باب کا عنوان تجویز کیجیے۔ انعام بہترین عنوان پر دیا جائے گا۔

صحیح جواب دے کر انعام بھی حاصل کریں اور اپنے نام پتے بھی شائع کرائیں۔ سوالات ہر ماہ بھی حاصل کریں اور اپنے نام پتے بھی شائع کرائیں۔ سوالات ہر ماہ کی پانچ تاریخ تک وصول کیے جائیں گے۔ انعام پانچ پانچ ناولوں کے پیکٹوں کی صورت میں ہوگا، ناول ہم اپنی پسند کے روانہ کریں گے۔

خبردار!

کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پہ جوابات نہ بھیجیں، ورنہ مقابلے میں شامل نہیں ہوں گے۔ تمام جوابات ایک ہی لفافے میں ارسال کر سکتے ہیں۔

(ادارہ)

پیارے انکل اشتیاق احمد آداب! کل آپ کے ناول ملے (افاقی ایس ۱۲، لاش کا انداز اور سنہری جال پڑھیں۔ خاص ابھی نہیں ملتیں۔ یہ خاص نمبر پچھلے خاص نمبر سے بہتر تھا، مگر جتنا اچھا ہونا چاہیے تھا، اتنا نہیں تھا۔ بڑوں کی سیریز کی کہانیاں پڑھیں، انتہائی بور تھیں۔ کالی موت تک ابن صفی مرحوم کی جاسوسی دنیا کی نقل ہے داخلہ تھا اسی طرح لکھا ہے۔

ج: شکریہ! لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ کتنا اچھا ہونا چاہیے تھا۔

پیارے انکل اشتیاق احمد السلام علیکم! اس ماہ کے چاروں ناول پڑھے، دوسرے کی لڑکی میں سرفراز اور فاضل نہیں تھے۔ لاش کا انداز بہت پسند آیا۔ کالی آنکھ کا خاتمہ کر کے اچھا کیا۔ خاص نمبر ہماری امیدوں سے بڑھ کر تھا۔ اس ناول میں خان رحمان نے فوجی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ڈی ایس پی سلطان نمبر راجہ کا کردار پسند نہیں آیا۔ سنہری جال اور فاضل ایس ۱۲ بھی پسند آئے۔ فاروق اور فرزانہ کی بکنگ کا بات

انتظار تھا، لیکن نہیں ہوئی۔

محمد سلطان، محمد زاہد ۲۵۹/۲ بی محلہ جلوٹیاں۔ اندرون بھاٹی گیٹ۔ لاہور

ج: شکریہ!

محترم اشتیاق احمد السلام علیکم۔ آپ کے کرداروں کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ ابن صفی مرحوم سے متاثر ہیں۔ کردار بھی انہی جیسے پیدا کیے گئے ہیں۔ غلام جیرال سنگ ہی جیسا ہے، ڈونگو بنگو پنج سے اور اسامہ عزلیات سے ملتے جلتے ہیں۔ کالی آنکھ شاید گارڈ زیلڈ کنگز کے چیف سے متاثر ہے۔

محمد حسین راشد۔ ۱۰۹ محلہ حبیب گنج۔ محبوب روڈ۔ لاہور

ج: یہ بات میں بہت پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں کچھ دوسرے غیر ملکی مصنفوں کے ساتھ ابن صفی مرحوم سے بھی متاثر ہوں، لیکن یہ بات غلط ہے کہ میرے کردار ان کرداروں کا چربہ ہیں۔

محترم اشتیاق احمد السلام علیکم! ایم ایس سی کی طالبہ ہوں، آپ کے ناول باقاعدگی سے پڑھتی ہوں، بلاشبہ آپ کی تحریریں شگفتہ اور زندگی سے قریب ہوتی ہیں، لیکن بیت کی لڑکی نے بہت مایوس کیا، آپ کا نام تو صاف ستھرے لٹریچر کی ضمانت ہے، آپ کو ایسا ناول نہیں لکھنا چاہیے تھا۔

نگہت حافظ، مقبول سٹریٹ۔ سمانہ، لاہور

ج: آپ کا طویل خط مختصر طور پر شائع کیا جا رہا ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں

آڈی کر دیپے کی زندگی میں اخلاق سے گری ہوئی بات کیا تھی۔ ذرا وضاحت کر دیں
ویسے یہ کہانی ایک معیاری ڈائجسٹ میں اس ماہ کی خاص کہانی کے اعزاز کے ساتھ
شائع ہو چکی ہے۔ خط کا تفصیل سے جواب آپ کو الگ دے رہا ہوں۔

پیارے اشتیاق بھائی! ناول دیر سے ملے، بہت غصہ آیا لیکن ناول پڑھ کر کافور ہو گیا۔ خاص نمبر میں واقعات کہیں رکتے نظر نہیں آتے۔ آپ نے واقعی کسی کردار سے ناانصافی نہیں کی۔ پچھلے خاص نمبر جیراں کا منصوبہ سے کہیں زیادہ پسند آیا۔ امید ہے، آئندہ بھی کوئی نمبر نکالیں گے

محمد افضل، محمد اکبر، محمد مجید، محمد اعجاز، محمد عثمان غازی (پتا نہیں لکھا)

ج: پسندیدگی کا شکریہ۔

پیارے بھیا اشتیاق احمد۔ آپ کے نئے ناول کل ملے۔ پڑھنے میں دیر لگ گئی۔ مالشا کا زلزلہ پسند آیا۔ ایک بات میں نے یہ محسوس کی کہ ناول اور لمبا ہو سکتا تھا۔ فائل ایس ۱۳ بھی اچھا تھا، سنہری جال پسند نہیں آیا۔
اتنا اچھا خاص نمبر نکالنے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

نفیس احمد خان معرفت صوفی کرم الٰہی مکان نمبر ۶/۱۵۹۱۔ گورنمنٹ ڈگری کالج روڈ۔ نزد اقبال کالونی۔ راولپنڈی۔

ج: مبارک باد قبول کر لی۔